﴿إِنْ هَـٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾

فرشتہ صفت انسان

یعنی

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ

(سابق ناظم ندوۃ العلماء)

از

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ

(خلیفہ ومجاز بیعت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

حواشی وترتیب جدید

سید محمود حسن حسنی ندوی

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات
۳۲۰

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

بار سوم
اکتوبر ۲۰۱۷ء --- محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

نام کتاب	:	فرشتہ صفت انسان
نام مؤلف	:	حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ
صفحات	:	۱۴۴
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	۱۱۰ روپے
باہتمام	:	محمد کلام الدین ندوی

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ
ندوہ کیمپس ندوۃ العلماء لکھنؤ

فون: 0522-2741539
Email:info@airp.org.in
airpnadwa@gmail.com

فہرست

۱- مقدمہ: مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۶
۲- دیباچہ وتعارف: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ	۱۰
۳- مقدمہ طبع جدید: مولانا سید محمد واضح رشید ندوی مدظلہ	۱۵
۴- تقریظ: پروفیسر وصی احمد صدیقی زید مجدہم	۲۰
۵- تأثراتی مکتوب: پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۲۴
۶- عرض مرتب	۲۶
۷- کچھ مؤلف کے بارے میں: مرتب	۳۰
۸- صاحب تذکرہ ایک سوانحی تعارف: مرتب	۳۸
۹- منظوم خراجِ عقیدت: مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	۴۷
۱۰- ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا ملكٌ كريمٌ﴾	۴۸
۱۱- فرشتہ صفت ہستی	۴۸
۱۲- تعارف، ملاقات اور تعلقات	۴۹
۱۳- خیر خواہانہ مزاج	۵۰
۱۴- ذمہ داری کا احساس اور توجہ کے اسباب	۵۱
۱۵- کامیاب وہمدرد اور مجتہد معالج	۵۲
۱۶- علاج ومعالجہ ایک شریفانہ انسانی خدمت	۵۲
۱۷- ڈاکٹر صاحبؒ کا طریقہ کار	۵۳

۱۸- کچھ ذاتی تجربات	۵۵
۱۹- بیماریوں کی کثرت اور ڈاکٹر صاحبؒ کا تأثر	۵۸
۲۰- مجتہدانہ شان	۶۰
۲۱- غیر معمولی قابلیت اور دست شفا	۶۱
۲۲- اوصاف وکمالات اور امتیازات وخصوصیات	۶۵
۲۳- إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ کی صحیح تصویر	۶۵
۲۴- احساس ذمہ داری، معاملہ فہمی اور دینی ودنیوی بصیرت	۶۶
۲۵- ایک مثالی مسلمان اور بحیثیت یوسف ثانی	۶۹
۲۶- لایعنی کاموں اور باتوں سے حد درجہ احتراز	۷۱
۲۷- اولاد کے عقد میں سنت نبویؐ کا پاس ولحاظ	۷۱
۲۸- شیخ ومرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے لیے اہتمام	۷۵
۲۹- حاجتمندوں کی امداد، صدقات وخیرات میں اخفاء اور سبقت	۷۶
۳۰- آمد وخرچ کا معاملہ اور اخفاء حال	۷۷
۳۱- صبر ورضا، توکل اور اصابت رائے اور حزم واحتیاط	۷۹
۳۲- ایمانی استقامت	۸۱
۳۳- تعلیم وتربیت	۸۴
۳۴- اولاد کی تعلیم وتربیت میں عمومی لاپرواہی اور اس کے نقصانات	۸۴
۳۵- ڈاکٹر صاحب کی فکرمندی اور ترجیحات	۸۵
۳۶- تعلیم وتربیت میں انوکھا اونا اور طریقہ کار اور اس کے اثرات	۸۶
۳۷- مربیانہ نفسیاتی فہم وفکر	۸۸
۳۸- دینی، دعوتی واصلاحی مقام	۹۰

۳۹- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے مناسبت ۹۰
۴۰- جامعیت اور فہم سلیم ۹۱
۴۱- طلب معاش رضا جوئی کی وجہ سے ضروری ہے ۹۳
۴۲- دعوتی و تبلیغی کوششیں ۹۴
۴۳- تبلیغی جماعت سے تعلق ۹۵
۴۴- لکھنؤ میں مجالس تھانویؒ میں شرکت ۹۶
۴۵- حضرت گیلانیؒ کی فراست اور راقم کی شہادت ۹۷
۴۶- ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات، مدیر ''الفرقان'' کے تاثرات ۹۹
۴۷- ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے چند خطوط ۱۰۵
۴۸- بہنوں کے نام خط ۱۳۵
۴۹- داماد کے نام خط ۱۳۶
۵۰- ایک یادگار اور تاریخی مکتوب بنام ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ ۱۳۸

● ● ● ● ●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد!

بعض شخصیتیں ذہن میں ایسی رچی بسی ہوتی ہیں اور ان سے ملنا، ان کا دیکھنا سننا زندگی کا ایسا معمول بن جاتا ہے کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ ان کو کب اور کہاں دیکھا تھا، اس کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اپنے گاؤں اور محلّہ کا یا وہاں کے رہنے والوں کا، کہ شعور کے ساتھ ہی ان کی جان پہچان اور ان کی دید وشنید شروع ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ ندوہ کے تعلق سے پھر بھائی صاحب مرحوم سے خصوصی مناسبت اور کثرت سے آمدورفت کی وجہ سے تعین کے ساتھ یہ یاد نہیں آتا کہ سب سے پہلے ان کو کہاں اور کب دیکھا تھا، اور کب سے ان سے نیازمندی شروع ہوئی، ایسا خیال آتا ہے کہ جب وہ تعطیلات گرما میں حیدرآباد سے لکھنؤ آتے تھے تو کبھی اپنے رفیق محترم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے ساتھ اور کبھی تنہا بھائی صاحبؒ سے ملنے مکان پر آتے، کشیدہ قامت، کھلتا

ہوا گندمی رنگ، باوجاہت، متناسب الاعضاء، جسم اور چہرہ نہایت جامہ زیب، لباس سادہ مگر نہایت صاف ستھرا، اودھ کے دیندار شرفاء ورؤساء اور ندوہ کے خوش ذوق و نستعلیق فضلاء کا نمونہ۔

مولانا عبدالباری صاحبؒ و برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ میں بڑے گہرے روابط وتعلقات تھے، دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں، اور یہی مناسبت و اتحاد کا قوی ذریعہ رہا ہے، دونوں معاملات اور حقوق العباد میں بہت محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے، دونوں مظاہر واشکال اور لوگوں کی تعریف وتنقید سے بے نیاز ہوکر شریعت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور فرائض کو نفلی عبادتوں اور تکمیلی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے، دونوں طبعاً ومزاجاً منتظم واقع ہوئے تھے اور حساب کتاب کے صاف اور اس میں بے تکلف تھے، دونوں مولانا مدنیؒ (۱) سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، ان مناسبتوں اور مشترک نقطوں کے باوجود تعلیم وتربیت، ماحول کے اختلاف اور خاندانی اثرات کی بنا پر دونوں میں بہت سی مابہ الامتیاز خصوصیتیں تھیں، اور جن کو خدا نے دو پیدا کیا ہے وہ کبھی ایک نہیں ہوسکتے، مولانا عبدالباری صاحبؒ میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا، وہ اپنے خلاف مزاج وخلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اسی وجہ سے ان کے چھوٹے اکثر ان سے خائف اور ان سے دور رہتے تھے، اور گھر کے کم افراد ان کے معیار پر اترتے تھے، ان کی اسی مزاجی خصوصیت کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ایک مرتبہ ایک بلیغ جملہ میں ادا کیا کہ ''مولانا عبدالباری چاہتے ہیں کہ شیطان مرجائے اور ایسا ممکن نہیں۔''

مولانا عبدالباری صاحبؒ نے بھائی صاحب مرحوم کو اپنا مستقل معالج بنا رکھا تھا اور وہ ان کے علاوہ اسی وقت کسی ڈاکٹر یا حکیم کی طرف رجوع کرتے تھے جب

---

(۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (م)

بھائی صاحبؒ ان کو مشورہ دیتے، وہ وحدتِ مرشد کے بھی قائل تھے اور وحدتِ معالج کے بھی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مشورہ سے انھوں نے بھائی صاحبؒ کو اپنا مشیر بھی بنالیا تھا، اخیر زندگی میں بھائی صاحب اور ان کے گھر سے ان کا تعلق بہت بڑھ گیا تھا، ہم میں سے کوئی چلا جاتا بہت خوش ہوتے اور بڑی شفقت واعزاز کا معاملہ فرماتے، بھائی صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان کی محبت ان کے فرزند محمد میاں سلمہ کی طرف منتقل ہوگئی تھی، اور مجھ خاکسار سے بھی بعض اوقات اس طرح پر اپنے تاثر کا اظہار فرماتے کہ میں ندامت سے پانی پانی ہو جاتا۔

مولاناؒ کی بیماری طویل رہی، ۱۹۷۱ء سے مکمل طور پر صاحب فراش ہو گئے تھے، اور ذہنی صلاحیتیں اور جسم تعطل کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس زمانہ میں بھی ان کا ذہن یادالٰہی، فکرِ آخرت اور دینی احکام کے معلوم کرنے سے غافل نہ تھا، اور یہ طویل مدت سعادت مند فرزندوں اور تیمارداروں کے لیے صبر آزما اور ان کے لیے رفع درجات اور تکفیر سیئات کا ذریعہ بنی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس طویل عرصہ میں ان کے گھر کے لوگ ان کی بیماری یا معذوری سے کبھی نہیں اکتائے، وہ ہمیشہ ان کی درازئ عمر کی دعا کرتے رہے، اور بڑی مستعدی، فرض شناسی کے ساتھ خدمت کی۔

اسی وفاداری اور خدمت وسعادتمندی کا ایک مظہر اور ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات کے بعد ان کے سعادتمند فرزندوں نے ان کی علمی یادگاروں، تصنیفی کارناموں اور افادات وافاضات کی حفاظت واشاعت کا اہتمام کیا، اور ان کے حالات وکمالات اور خصوصیات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی، پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور اسی سعادتمندی ووفاداری کا ایک مظہر ہے کہ مرحوم کو جن بعض شخصیتوں سے خصوصی ارتباط اور طبعی وذہنی واخلاقی مناسبت تھی، ان کا بھی تعارف کرایا جائے، اور ان کو بھی مولاناؒ ہی کے حالات وکمالات کے سلسلہ میں ناظرین کے

سامنے لایا جائے، یہ کتاب اسی کوشش کی ایک تکمیل اور اسی مقصد کے اظہار کی ایک شکل ہے، اللہ تعالیٰ مولانا کے فرزندوں کو اور اس کام کی کوشش کرنے والوں کو اس کا اجر وصلہ عطا فرمائے، اور وہ مولاناؒ کی روح کی خوشنودی کا سبب ہو۔

وماذلك على الله بعزيز.

(حضرت مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی
۱۰/صفر المظفر ۱۴۱۶ھ

تعارف ودیباچہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین وبعد!

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز فرزندوں میں تھے، انھوں نے ایک طرف ادبی وعلمی ذوق اور بحث وتحقیق کی صلاحیت اپنے نادرۂ روزگار استاد علامہ شبلی نعمانیؒ کی تربیت ورہنمائی میں حاصل کی تھی اور دوسری طرف دین وصلاح وتقویٰ میں خصوصی امتیاز حاصل کرنے اور اس پر کاربند رہنے کا مزاج اپنے عہد کے عظیم روحانی بزرگوں، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے فیض صحبت وتربیت سے بنایا تھا، اوراس میں وہ حکیم الامت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کی طرف سے خلافت سے سرفراز ہوئے، چنانچہ وہ ایک طرف ادب، فلسفہ وعقلیات میں اول درجہ کے فاضل اور یونیورسٹی میں اس شعبہ کے سربراہ ہوئے اور دوسری طرف اصلاح نفس وباطن کے مربی بنے اور اصلاح باطن ورشد وہدایت کی ترغیب وترویج اور اس کی علمی تسہیل کے کام پر اپنی زندگی کو وقف کردیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس پر کاربند رہے، چنانچہ ان کی تعلیم وصحبت سے سیکڑوں کے لیے صحیح اسلامی اخلاق واعمال کی راہیں عیاں ہوئیں، اور ان کی تحریری کوششوں نے فکر وذہن کی عقدہ کشائیاں کیں۔

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں شعبۂ فلسفہ کے

استاد و سربراہ رہے، اور سیکڑوں طالب علموں کو اونچے درجات میں فیض پہنچایا، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد لکھنؤ میں اقامت اختیار کی اور اپنی زندگی کی کئی دہائیاں مفید تصنیفی و تربیتی کاموں میں صرف کیں، اس طرح ان کی لکھنؤ میں قیام گاہ جو "شبستان سعادت" کے نام سے موسوم ہے مستفیدین کے لیے جائے استفادہ بنی رہی، ندوۃ العلماء سے اس جگہ کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، قدرداں اساتذہ وطلباء کی برابر وہاں آمد و رفت رہتی اور وہ حضرت مولاناؒ کے درس ومجلسی افادات سے اخذ فیض کرتے، اس دوران حضرت مولاناؒ کا سلسلۂ تصنیف وتالیف بھی جاری رہتا، اس سلسلہ میں حضرت مولاناؒ نے تصوف وسلوک کے نکتوں اور حقیقتوں کی وضاحت پر کئی کتابیں تصنیف فرمائیں، اور ان میں اپنے مرشد اور اصلاح باطن کے مشہور مربی حضرت تھانویؒ کے ملفوظات وارشادات کی تشریح ایسے اسلوب میں کی جو تصوف کی اصطلاحات وقواعد سے متوحش لوگوں کے لیے بھی انشراح پیدا کرنے والا تھا، اس سلسلہ میں "تجدید تصوف وسلوک"، "تجدید دین کامل" (جامع المجدد دین)، "تجدید تعلیم وتبلیغ"، "تجدید معاشیات" وغیرہ کتابیں قابل ذکر ہیں۔

تصوف کے علاوہ فلسفہ وعلم سائنس پر بھی حضرت مولانا مرحوم نے جو گہرا مطالعہ کیا تھا، اور ان علوم میں خالص قدرت الٰہی سے جو وابستگی ہے، اس کے رازہائے سربستہ کو انھوں نے جو سمجھا، اس پر بھی اہم تحقیقی کتاب تصنیف فرمائی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس مطالعہ سے جو نتیجہ اخذ کیا، اس کے تحت یہ رائے اپنائی کہ مادّہ اور مادّیت جس کا تذکرہ اہل دین اور اہل دنیا دونوں کرتے ہیں، کسی حقیقت پر مبنی نہیں، مادّہ محض طاقت ہے، مظہر اس کا جو بھی ہو، مولاناؒ نے نظریہ اضافیت کو بھی سمجھا اور اس کی اساس پر اپنے نتائج مطالعہ وفکر کو قلمبند کیا، مولاناؒ نے اس سلسلہ میں اپنی اہم کتاب "مذہب اور سائنس" تصنیف فرمائی، جس کو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام نے

شائع کیا، یہ ان کی زندگی کی بالکل اخیر کی تصنیفات میں ہے، اس میں ان کے کئی دہائیوں کے مطالعہ فلسفہ وسائنس کا نچوڑ آگیا ہے، اس سے بہت قبل مذہب وعقلیت کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کی ایک اہم تصنیف آچکی تھی، جس کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے، اور مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

مولاناؒ کے عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں ان کے ہم ذوق معاصر اصحاب علم سے ان کے روابط محبت واخوت بہت اچھے قائم رہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور متعدد حضرات سے ان کے روابط معروف ومشہور رہے ہیں، ان ہی معاصر دوستوں میں ان کے معاصر اور ندوی فاضل وشہر کے مشہور معالج مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ بھی ایک اہم فرد تھے، ڈاکٹر صاحب نے ندوۃ العلماء کی تعلیم پوری کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا تھا، جہاں انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا تھا، اس کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی تھی، اور اس میں ان کی یہ خاص بات تھی کہ طب یونانی کے نصاب کو پورا کرنے کے بعد انھوں نے ایلوپیتھیک کا نصاب پورا کیا، اور اس زمانہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم بڑی توجہ سے دی جاتی تھی، اور ملک میں چند گنے چنے میڈیکل کالج تھے، جن میں لکھنؤ کا کنگ جارج میڈیکل کالج بھی تھا، البتہ ایلوپیتھک کے بعض شعبے اس میں نہ تھے، ان کے لیے ڈاکٹر صاحب کو مدراس (چینئی) اور الٰہ آباد بھی جانا ہوا تھا، الٰہ آباد یونیورسٹی سے انھیں گولڈ مڈل بھی ملا تھا، اس سب کے نتیجہ میں ڈاکٹر صاحبؒ شہر لکھنؤ کے ممتاز معالج بنے، عالم دین اور دیندار ہونے کے باعث ان سے علماءِ دین کے اچھے تعلقات تھے، ان علماء دین میں حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں، جن سے ان کے روابط نہایت محبانہ اور دوستانہ تعلق میں تبدیل ہو چکے

تھے، ڈاکٹر صاحبؒ نے بھی اصلاح باطن کی راہ سے اپنے وقت کے مرشدین سے تعلق قائم رکھا تھا، ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ان کے شیخ خاص تھے، ان سے ڈاکٹر صاحبؒ کے تعلق استرشاد میں حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ صاحب سے وحدت و یکجہتی بھی حاصل تھی، اس تعلق نے ایک دوسرے کی قدر شناسی اور محبت کو بہت بڑھا دیا، مولانا عبدالباری صاحبؒ نے علاج کے معاملہ میں تنہا ان ہی کو اختیار کر لیا تھا، اور اس محبت و اخوت کے تقاضہ سے پابندی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے۔

مولانا عبدالباری ندوی صاحبؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ڈاکٹر صاحب سے اپنے تعلق کو اور ان کی ان صفات کو جن کی قدر دانی ان کے دل میں بہت تھی، اپنی ایک بہت مخلصانہ اور محبانہ تحریر میں قلمبند فرمایا، یہ تحریر غیر مطبوعہ حالت میں ان ہی کے مسودات میں رکھی تھی کہ ان کے لائق فرزندوں برادرم جناب فضل الباری صاحب اور برادرم جناب حافظ احمد الباری صاحب کی نظر اس پر پڑی، ان کے دل میں اس کی اشاعت کا تقاضہ پیدا ہوا، چنانچہ پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' میں اس کی اشاعت کی، پھر ان کی خواہش ہوئی کہ اس کو علاحدہ پمفلٹ کی شکل میں طبع کرا دیا جائے، اس تحریر میں بعض بعض جگہیں قارئین کے لیے لائق تشریح تھیں جن کی وضاحت ضروری سمجھی گئی، اس کے لیے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بڑی صاحبزادی کے پوتے مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی کا انتخاب کیا گیا، ان کو تاریخی روحانی حالات کے مطالعہ کا اچھا ذوق ہے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اچھے طریقہ سے انجام دیا، اور اس تحریر پر نوٹس تیار کیے، اور تحریر میں جو جگہیں لائق تشریح تھیں ان کی تشریح کر دی، مولانا عبدالباری ندویؒ اور ڈاکٹر صاحبؒ کے حالات زندگی پر بھی نوٹ لکھے، اور اس طرح یہ پمفلٹ زیادہ مفید اور واضح ہو گیا، اور اس کو قابل طباعت سمجھا گیا، چنانچہ وہ طباعت

کے لیے دیا جا رہا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں صاحبزادگان برادرم مکرمی فضل الباری و برادرم مکرمی احمد الباری صاحبان نے اس پمفلٹ پر تعارفی دیباچہ لکھنے کی ذمہ داری مجھ نیازمند پر ڈالی، حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی جو شفقتیں میری حقیر ذات پر رہی ہیں، ان کی قدر کے طور پر مجھ کو اس کام سے معذرت کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا، بلکہ مناسب یہ معلوم ہوا کہ ان کے تذکرہ وتوصیف کی سعادت میں اپنے قلم کو شریک کروں، لہٰذا یہ چند سطریں میں نے پیش کر دیں۔

برادر گرامی جناب فضل الباری صاحب و جناب حافظ احمد الباری صاحب نے صرف اس رسالہ کی اشاعت سے ہی دلچسپی نہیں لی، بلکہ انھوں نے اس سے قبل بھی اپنے والد حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی کتابوں کو جو علم وفکر، اخلاق واصلاح باطن کے مضامین کا گنجینہ ہیں، نئے ایڈیشنوں کی شکل میں شائع کیا ہے، اس طرح قارئین اور مستفیدین کے لیے وہ کتابیں نئے روپ میں دوبارہ آ گئی ہیں، اور استفادہ کی آسانی ہو گئی ہے، اس طرح ان فرزندان گرامی نے اپنے والد گرامی مرحوم کے قیمتی افکار کی توسیع کا نیک فریضہ انجام دیا ہے، میں اس پر ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی دینی وعلمی خدمات سے طالبان دین و علم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

(حضرت مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی

لکھنؤ ۲؍جولائی ۱۹۹۵ء

مقدمہ طبع جدید

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ العالی

الحمد لله الذی کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد!

پیش نظر رسالہ ''فرشتہ صفت انسان'' دراصل مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا وہ تاثراتی مضمون ہے جو انھوں نے اپنے بہت ہی محبوب رفیق مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء و برادر اکبر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر لکھا تھا، وہ مضمون تعمیر حیات میں شائع ہوا، بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا، اب اس کا دوسرا ایڈیشن مزید حواشی اور نئی تاریخی معلومات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

پہلے ایڈیشن میں مضمون نگار اور صاحب مضمون کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا تھا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا وہ مضمون جو دونوں شخصیتوں کے تعارف پر تھا وہ بھی مقدمہ کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے دونوں شخصیتوں میں باہمی مناسبت اور ارتباط پر روشنی ڈالی تھی، اور جو خصوصیات دونوں میں مشترک تھیں ان کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا تھا، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولانا عبدالباری صاحبؒ و برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ میں بڑے گہرے روابط و تعلقات تھے، دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں، اور یہی مناسبت و اتحاد کا قوی ذریعہ رہا ہے،

دونوں معاملات اور حقوق العباد میں بہت محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے، دونوں مظاہر و اشکال اور لوگوں کی تعریف و تنقید سے بے نیاز ہوکر شریعت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور فرائض کو نفلی عبادتوں اور تکمیلی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے، دونوں طبعاً و مزاجاً منتظم واقع ہوئے تھے اور حساب کتاب کے صاف اور اس میں بے تکلف تھے۔''(۱)

جن خصوصیات کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور ان کو ان دونوں شخصیتوں کی امتیازی خصوصیات اور مشترک امتیاز قرار دیا ہے، وہی اس رسالہ کی اہمیت اور افادیت کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس لیے کہ یہ خصوصیات اس عہد میں تقریباً مفقود ہیں، یا نادر المثال بہر حال ہیں، اس عہد کا ایک مرض نفل کو فرض پر، اخلاقیات کو فرائض پر اور معاملات کو حقوق پر ترجیح دینے کا ہے، اسی طرح مظاہر و اشکال کو حقیقت و باطن پر غالب کرنے کا ہے، اور یہی حقیقت میں مرض العصر ہے، جس سے دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی مستثنیٰ نہیں۔

اس رسالہ کے مطالعہ سے یہ مفقود کڑی سامنے آتی ہے اور اس کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے، تعلیم اور تربیت کے لحاظ سے دونوں شخصیتوں میں کافی اختلاف تھا، اسی طرح مزاجی کیفیت میں بھی دونوں میں بڑا فرق تھا، مولانا عبدالباری صاحب بڑے مصنف و فلسفیانہ مزاج رکھنے والے تھے اور شدت پسند واقع ہوئے تھے اور وہ اپنے نقطہ نظر کو قوت و صراحت اور شدت کے ساتھ بیان کرتے تھے، ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کم گو، خاموش طبیعت اور نرم مزاج تھے، لیکن سابق الذکر خصوصیات میں دونوں مشترک تھے اور ان کی رفاقت اور آپسی تعلقات کی اصل وجہ یہی مشترک

---

(۱) ماخوذ از مقدمہ کتاب ہذا ص/ ۷

خصوصیات تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی نرم مزاجی کی وضاحت اس عنوان سے ہوتی ہے جو مضمون نگار نے ان کے لیے اختیار کیا، یعنی ''فرشتہ صفت انسان'' انھوں نے ان کو ایک مثالی انسان قرار دیا، ان کے نزدیک جو صفات ان میں پائی جاتی تھیں وہ مثالی انسان کے لیے ضروری ہیں، ان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں:

''یہ راقم ۴۲ سالہ قریب سے قریب اور نجی سے نجی معاملات و تعلقات پر مبنی تجربات و تاثرات پر مبنی آخر میں پھر اس شہادت پر ختم کرتا ہوں کہ نہ ان کی نگاہ قلب ایک معاملہ میں بھی دین سے ہٹتی دیکھی نہ ان کے قالب کا کوئی فعل وعمل اتفاقی طور پر بھی خلاف دین دیکھا، ذہن پر زور ڈالنے پر بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ کبھی ایسا دیکھا ہو، تفصیل میں جاؤں تو کسی رسالہ کا ضخیم نمبر یا کتاب بھی کافی نہ ہوگی، بس ''بزور بازو نیست'' والی قلب وقالب دونوں کی اس بے داغ زندگی والی سعادت کو خدا بخشندہ کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے: ﴿ إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴾۔''

یہ شہادت کسی ادیب وشاعر کی نہیں بلکہ اس شخص کی ہے جس کا اصل موضوع فلسفہ اور پھر تربیت و اصلاح تھا، جس نے اصلاح وصلاح کے اصول ومبادی اور تقاضوں پر کتابیں لکھیں اور اس نے خود اپنے بارے میں تحریر کیا ہے جس سے اس کے معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ اپنے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''اپنی آنکھوں کے شہتیر سے آنکھیں بند کرکے دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے والا یہ راقم۔''

اس مضمون کو جو مثالی شخصیت سے متعلق ہے اور ایک محقق، باریک بیں،

فلسفیانہ مزاج رکھنے والے کے قلم سے ہے اور اس میں متعدد شخصیات اور حالات و وقائع کا تذکرہ آیا ہے، عزیزی مولوی محمود حسن حسنی ندوی نے جن کو سوانح نگاری اور تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے اور اس کو پیش کرنے کی صلاحیت حاصل ہے، مفید حواشی سے آراستہ کیا تھا، اس میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا دونوں شخصیتوں کا تعارف بھی شامل کیا اور اب کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں مدیر ماہنامہ ''الفرقان'' مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی زید مجدہ (حال مقیم لندن) کے تأثرات بھی جو ڈاکٹر صاحب کی وفات پر ''الفرقان'' میں شائع ہوئے تھے شامل کردیئے ہیں، جس سے اس رسالہ کی افادیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے، اسی دوسرے ایڈیشن میں عزیزی محمود حسن حسنی ندوی نے ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے خطوط کو جو انھوں نے اپنے برادر اصغر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو لکھے اور ان خطوط میں بعض تربیتی خطوط بھی ہیں، جن میں تعلیم و دعوت اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں ہدایات ہیں، شامل کردیا ہے، جس سے اس رسالہ کی افادیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے، اس کے ساتھ ایک تفصیلی خط کا اضافہ کیا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی تعلیم اور ملازمت کے سلسلہ میں اپنے والد محترم مولانا حکیم عبدالحی حسنی صاحب کو لکھا تھا، اس سے ان کے ذہنی رجحان اور مقصد حیات اور مسائل کو حل کرنے میں ان کا تصور اور معیار واضح ہوتا ہے، کتاب کے اس حصہ خطوط میں بعض اور اہم خط بھی ناظرین ملاحظہ کریں گے۔

ان اضافوں نے رسالہ کی اہمیت اور افادیت میں بڑا اضافہ کردیا ہے، اور یہ اہل علم و دعوت کے لیے اور طلبہ و اساتذہ اور عوام و خواص کے لیے یکساں طور پر مفید بلکہ گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اس مختصر رسالہ میں چار اہم شخصیتوں کے مراحل حیات اور صفات و معاملات سے ایک نظر میں واقفیت حاصل کرسکتے ہیں، مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمہم اللہ۔

یہ رسالہ حجم کے اعتبار سے کتنا ہی مختصر ہو مگر اپنی افادیت اور قیمت کے لحاظ سے ضخیم تذکروں سے زیادہ مفید ہے، اس سے اس پورے عصر کی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے جس عصر سے ان شخصیات کا تعلق ہے۔

اس رسالہ کی اشاعت میں مولوی محمود حسن حسنی کے ساتھ مولانا عبدالباری ندوی کے فرزند گرامی جناب فضل الباری صاحب کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے مولانا کی تصنیفی اور علمی کاوشوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

خود مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس کا اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، اس کو یہاں نقل کرنا مناسب ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولانا مرحوم کی وفات کے بعد ان کے سعادتمند فرزندوں نے ان کی علمی یادگاروں، تصنیفی کارناموں اور افادات و افاضات کی حفاظت و اشاعت کا اہتمام کیا اور ان کے حالات وکمالات وخصوصیات کو سامنے لانے کی کوشش کی، پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اسی سعادتمندی اور وفاداری کا ایک مظہر۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ رسالہ عوام وخواص کے لیے یکساں طور پر مفید ہو۔

(حضرت مولانا سید) محمد واضح رشید حسنی ندوی

معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دوشنبہ یکم محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

تقریظ

جناب پروفیسر وصی احمد صاحب صدیقی زید مجدہم

کچھ کتاب کے بارے میں

پروفیسر عبدالباری صاحب مرحوم ومغفور کی تصنیف کردہ یہ کتاب اس لحاظ سے غیر معمولی ہے کہ عام طور پر بزرگوں پر تصانیف یا تو ملفوظات کی شکل میں ہوتی ہیں جن کو مرید والہانہ محبت سے پیش کرتے ہیں یا سوانح عمریاں جو اپنے مشرقی پس منظر میں وہ لوگ لکھتے ہیں جو عقیدتمند ہوتے ہیں اور اپنے ممدوح کو اپنے اور عام لوگوں سے بہت بہتر سمجھتے ہیں اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے لیے اپنے تحقیقی مزاج اور لکھنے کی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس کے مصنف مرتبہ اور علم وفضل میں دانشوروں کے صف اول میں ہیں، اور وہاں بھی بڑا مقام رکھتے ہیں، اس کتاب کی تصنیف میں نہ ان کو ستائش کی تمنا تھی نہ کسی صلہ سے معاملہ تھا، صرف اپنے تجربات اور اپنے احساسات کا بیان ہے، سوانح عمری سے معاملہ میں، پیدائش، خاندان کا ذکر تو برسبیل تذکرہ آئے گا ہی، اس کے بغیر کتاب مکمل کیسے ہوگی، مگر یہ یہاں مقصود بالذات نہیں، جہاں ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کا ذکر ہو وہاں حضرت علی میاںؒ کا ذکر تو ہونا ہی ہے، مولانا رابع اور مولانا واضح صاحبان کو تصویر میں خود بخود جگہ ملے گی، یہ سلسلہ تو طلائے ناب سے ہے، یہ خانہ ہمہ آفتاب ہے۔

مصنف کتاب حدیث خواب نہیں کہہ رہے ہیں، نہ شمہ نہ شب پرستم کی بات ان پر بالکل صحیح ہے، ہمہ ز آفتاب گویم والا معاملہ ہے۔

کتاب کا نام جو "مَـلَكٌ كَرِيْمٌ" کا آزاد ترجمہ ہے، کس قدر برمحل اور بامعنی ہے، سامنے زنانِ مصر آجاتی ہیں، جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر بے ساختہ یہ کہا تھا اور عزیز مصر کی بیوی کے قصور کو حق بجانب سمجھا تھا، ورنہ ہاتھ کیوں کاٹ لیتیں، حضرت یوسف علیہ السلام سے ڈاکٹر صاحب کی مماثلت بالکل صحیح ہے، حسن یوسف سے بھی معاملہ تھا اور اس تبلیغ سے بھی کہ چھوٹے چھوٹے بہت سے خدا تمہیں پسند ہیں یا ایک واحد قہار، تبلیغ ڈاکٹر صاحب کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی، اس وقت بھی جب تبلیغی جماعت بروئے کار نہیں آئی تھی اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ تبلیغ کی افق پر نمودار نہیں ہوئے تھے، مبلغین کو ادھر ادھر ضرورت کی جگہوں پر بھیجنے کا کام مستقل جاری تھا، اس سلسلہ میں مجھے اپنے مولوی سکندر علی صاحب مرحوم ومغفور یاد آتے ہیں، صوفی منش تھے اور قلندر صفت، ہمارے گھر سے بیحد تعلق رکھتے تھے، اور ہم لوگوں کو بیحد عزیز، کسی ملازمت کے نام پر تین حرف بھیجتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب کے بیحد عقیدتمند اور ڈاکٹر صاحب ان سے مانوس، ایک دن دیکھا کہ مولوی صاحب اپنا مختصر بستر باندھ رہے ہیں، پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بھٹکل بھیج رہے ہیں، اہالیان بھٹکل کی فرمائش پر برائے تبلیغ، ہم لوگوں نے بڑے افسوس کے ساتھ انھیں رخصت مگر سال بھر کے بعد وہ آگئے، اللہ جانے کتنا کام کیا ہوگا، مگر ڈاکٹر صاحب کی بارگاہ میں ویسا ہی باریاب، مولوی صاحب کے انتقال کا حال بیان کر دوں، نظیر آباد کی مسجد میں جماعت کی نماز میں حالت سجدہ میں اپنے خالق سے جا ملے، پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کہ توجہ کے پورے حقدار تھے۔

یہ باتیں کتاب سے تعلق نہیں رکھتیں مگر صاحب کتاب سے تو ہیں، اب

اپنے والد مرحوم کی بات بھی بتادوں، ڈاکٹر صاحب کے نام کے عاشق تھے، اگر ہم بھائیوں کی گفتگو میں کبھی ڈاکٹر صاحب کا ذکر آجائے اور دور سے سن لیں تو فوراً پوچھتے تھے کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا ذکر کیسے آیا؟ اس والہانہ جذبہ کو ہم لوگ نہیں سمجھ پاتے تھے، سوچتے تھے کہ ندوہ کے اساتذہ میں ایک ہمارے والد بھی ہیں، اور وہ ناظم ندوہ، نقطہ اتصال کہاں ہے؟ ایک دن پوچھ لیا، فرمایا کہ ہم بی.ٹی. کے لیے علی گڑھ جانا چاہتے تھے لیکن سوچتے تھے کہ چھٹی اگر ملی تو بلا تنخواہ، پھر گذر کیسے ہوگی، ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے، ڈاکٹر صاحب نے باوجود اپنی کم گوئی کے بیحد مہربانی کے کلمات کہے، اور چھٹی مع تنخواہ کے منظور کی، جس کی نظیر ندوہ میں نہ تھے، ڈاکٹر صاحب کا تعلق بھی احسان شناس سے تھا، اور بہت سی باتیں بتائیں، یہ تو ''مشتے نمونہ از خروارے'' تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا تھا، اس سے پہلے نہ معلوم کتنی مرتبہ مطب میں حاضری دی، ان سے صرف ملاقات کرنے کے لیے جانے کی ہمت کہاں تھی، ہمیشہ بحیثیت مریض کے گیا، نبض پر ہاتھ رکھتے تھے تو ایسا احساس ہوتا تھا کہ آدھا مرض دور ہوگیا، یہ بیان تو واقعہ ہے شاعرانہ انداز بیاں نہیں، جیسے روشنی کی شعاعیں کسی چراغ سے نکلتی ہیں ویسے ہی ڈاکٹر صاحب کی ذات مبارک سے مہربانی کی شعاعیں نکلتی تھیں، جو دل پر پڑتی تھیں، اس کی وضاحت میں کیسے کروں، جن لوگوں کا معاملہ ڈاکٹر صاحب سے پڑا ہے، اسے شاید وہ محسوس کرلیں۔

کتاب پر لکھنے چلا تھا مگر آپ بیتی بیان کرنے لگا، ڈاکٹر صاحب کا جب ذکر آئے تو کسے ان کی صفات یاد نہ آئیں، مگر بیان کا حق کیسے ادا ہو؟ یہ کام تو جناب مولانا رابع صاحب، جناب مولانا واضح صاحب تو اپنی تحریروں میں بشکل دیباچہ و مقدمہ کر چکے ہیں، بالکل مکمل اور بھرپور اور اختصار بلاغت کی جان ہے کی صحیح تصویر، کتاب پر مقدمہ حضرت مولانا علی میاںؒ کا ہے، اپنے مخصوص طرز انشاء کے ساتھ، حضرت

مولاناؒ تو دلوں کے بادشاہ تھے، پورا مضمون کلام الملوک ملوک الکلام کا آئینہ دار ہے، کتاب کے آخر کے خطوط کیسے چشم کشا ہیں، یہ حضرت مولانا کا ابتدائی زمانہ ہے، اس وقت بھی بڑے بھائی جو ہدایتیں دے رہے ہیں وہ نجی خط میں مشکل سے ملیں گی، گھریلو معاملات کا بڑا ہلکا ذکر اور صرف کلمۃ الحق کی باتیں، یہ کرو، ان سے بات کرو، اس مجلس میں جاؤ، سعادتمند بھائی نے پورے جوش اور جذبہ سے اس پر عمل کیا، شرق اوسط کی ڈائری اس پر گواہ ہے۔

حکایت کی درازی اس کے لذیذ ہونے کے سبب سے ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کتاب پروفیسر عبدالباری صاحب کو اعلیٰ درجات سے نوازے، اور دونوں رفیق جنت میں ایک ساتھ ہوں، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جس سے محبت کرتا ہے جنت میں اس کے ساتھ ہوگا۔ صحابہ کرامؓ کو اس بات سے بڑی خوشی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب نے ابلیس کو ہمیشہ زیر رکھا، گو بقول حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے "شیطان مرنہیں سکتا۔"

مولوی محمود حسن حسنی بیحد قابل مبارکباد ہیں جو اس کتاب کو نیا قالب دے رہے ہیں۔

(پروفیسر) وصی احمد صدیقی
معتمد مال و نائب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تأثراتی مکتوب

پروفیسر ضیاءالحسن صاحب فاروقی

[ذیل میں اس مکتوب کا اقتباس دیا جارہا ہے، جو رسالہ ''فرشتہ صفت انسان'' کے مطالعہ کے بعد عصر جدید کے ممتاز مفکر مصنف، محقق، دانشور جناب پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی (م ۱۹۹۶ء) ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی و مدیر ''اسلام اور عصر جدید'' نئی دہلی نے راقم کو تحریر فرمایا تھا، جس میں کچھ ہدایت بھی ہیں جن کا طبع جدید میں خیال رکھا گیا ہے۔] (محمود)

باسمہٖ تعالیٰ

ذاکر نگر۔نئی دہلی

۲۵/اکتوبر ۱۹۹۵ء

عزیز مکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پوسٹ کارڈ جس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے، چند روز ہوئے موصول ہوا تھا، اس میں اس رسالے کو طارق امین صاحب کے ذریعہ بھجوانے کا ذکر تھا، جسے آپ نے ترتیب دیا ہے، اور حواشی لکھے ہیں اور جس کا مجھے حد درجہ اشتیاق تھا، انھوں نے وہ رسالہ مجھے ۲۳/اکتوبر کو لا کر دیا۔

رسالہ پا کر بڑی خوشی ہوئی اور اسے پڑھ کر اور بھی خوشی ہوئی، مبارکباد!

صفحہ ۲۶ تک جو مضامین شامل ہیں، اور جن میں حضرت مولانا مدظلہ اور مولانا سید محمد رابع صاحب کی قابل قدر تحریریں بھی ہیں، ان سے رسالہ کی قدر و قیمت خاصی بڑھ گئی ہے، اور مرحومین مولانا عبدالباری صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے

بارے میں مفید معلومات بھی فراہم ہوگئی ہیں، آپ کے شوق، توجہ اور محنت سے ۸۰ صفحے کا یہ رسالہ ایک ایسی علمی خدمت ہے جو ڈاکٹر صاحبؒ پر ایک کتاب کی بنیاد بن سکتی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، مناسب سمجھیں تو ہمت کیجئے، مواد تو کافی آپ کے پاس ہوگا، خصوصاً مکتوبات وغیرہ۔

آپ کے حاشیے بھی بہت مفید اور معلومات افزا ہیں، کئی کتابیں مجھے نئی معلوم ہوئیں، دراصل ایسے مضامین پر اگر حواشی نہ ہوں تو قارئین اور خصوصاً نئی نسل کے لیے مضمون کی افادیت کم ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کو شادمانیوں سے بھر دے کہ آپ نے یہ بہت اچھا کام کیا۔

میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں اور دل سے کرتا ہوں۔

فقط والسلام

آپ کا مخلص

ضیاء الحسن فاروقی (☆)

(☆) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا شمار معروف مفکر مصنفین اور ممتاز اسلامی محققین میں تھا، ان کی وفات پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے جو تأثرات اپنی کتاب ''کاروان زندگی'' میں لکھے تھے وہ پیش کیے جارہے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

''ایک حادثۂ وفات محبی پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی کا ہے جو ۳۰ جولائی ۱۹۹۶ء کو پیش آیا، وہ اپنی حمیت دینی، دینداری اور اصلاح کے ساتھ تاریخ و ادب اور سیاسی و علمی، ادبی و فکری، نیز دینی و اصلاحی تحریکات و انقلابات پر گہری و وسیع نظر رکھتے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے قرابت کا رشتہ بھی تھا، اور آپ ان کے برادرزادہ مولانا وحید احمد صاحب اسیر مالٹا کے داماد بھی تھے، سالہا سال جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مؤقر استاد اور ایک عرصہ تک قائم مقام شیخ الجامعہ بھی رہے، پھر ذاکر حسین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار اسلامک اسٹڈیز کے صدر رہے، وہ دار المصنفین اعظم گڑھ (شبلی اکیڈمی) کی مجلس انتظامی اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان میں سے شاید (فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کو مستثنیٰ کرکے) کسی سے راقم کو ایسا ربط اور مناسبت نہیں رہی، جتنی پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی سے تھی۔'' (کاروان زندگی جلد ششم ص/ ۲۶۹-۲۷۰)

عرض مرتب

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین وبعد!

بڑی مسرت کی بات ہے کہ کتاب فرشتہ صفت انسان جو حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا "إنْ هٰــذا إلَّا مَـلَكٌ كَـرِيْـمٌ" کے عنوان سے ایک تاثراتی مضمون تھا، جس کا مسودہ صاف کرنے کے لیے مضمون لکھے جانے کے تقریباً ۲۸ رسال بعد راقم کو ملا، اس نے اپنے لیے عین سعادت جان کر یہ شرف حاصل کرنے کی کوشش کی، اور جہاں جہاں اس کو کوئی لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے اپنے بڑوں کی خدمت میں اس مشکل کو پیش کر کے اس کا حل پایا، اور اللہ کے فضل وکرم سے یہ کام انجام پا گیا، اور استاذ گرامی جناب مولانا شمس الحق صاحب ندوی مدظلہ نے یہ مزید کرم فرمایا کہ چار قسطوں میں اسے "تعمیر حیات" کے شماروں میں دسمبر ۸۹ء اور جنوری ۹۰ء میں شائع کیا، جس کے بعد اس تقاضہ نے زور پکڑا کہ اسے کتابی شکل دے دی جائے اور یہ سعادت بھی اس گنہگار و عاجز کے حصہ میں آئی، کچھ وضاحتوں اور بعض شخصیات کے تعارف کے ساتھ یہ کام بھی ماشاء اللہ جلد ہی انجام پا گیا، حضرت مرشد مخدوم معظم و مربی جلیل مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (نَــوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ وبَرَّدَ مَضْجَعَهٗ) نے اس درخواست کو قبولیت بخشی کہ بطور ابتدائیہ کے ان کے تاثرات شامل ہو جائیں، اور مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے دیباچہ تحریر فرمایا، اس طرح یہ کتاب مکمل ہوگئی۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے صاحبزادگان بالخصوص محترم

جناب فضل الباری صاحب اور محترم جناب حافظ احمد الباری صاحب نے اشاعت کی ذمہ داری لی، اور وہ اس سعادت کے مستحق ہوئے کہ "إن من أبر البر أن يصل الرجل أهل ودّ أبيه بعد أن يولّي" (۱) (سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے اہل تعلق سے صلہ رحمی کرے)۔

کتاب شائع ہونے پر الحمد للہ مقبول ہوئی اور ایسے خطوط بھی حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ کے نام آئے جن میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ "ڈاکٹروں میں اس کو تقسیم کرنا بڑا مفید ہوگا۔" (۲)

اس موقع پر ہمیں اپنے محسن وکرم فرما مخدومی پروفیسر جناب ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۹۹۶ء) کی بھی یاد آرہی ہے کہ انھوں نے اس کام پر ہمت افزائی فرمائی، اور بڑے مفید مشورے دیئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خصوصی فضل وکرم کا معاملہ فرمائے۔ دوسرے محسن جناب حافظ ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی معاون ناظر شعبہ تعمیر وترقی ندوۃ العلماء ہیں جنھوں نے کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد کچھ تسامحات کی طرف اشارہ کیا تھا، اس جدید ایڈیشن میں ان ہدایات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

اسی مناسبت سے استاذ مکرم مولانا محمد رضوان ندوی علیہ الرحمہ کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ انھوں نے اس کی اشاعت وفروغ میں خصوصیت سے حصہ لیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

مخدوم ومحترم جناب وصی احمد صدیقی دام اقبالہ (معتمد مال ونائب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا جس قدر شکر گذار ہوا جائے کم ہے، صاحب تذکرہ سے متعلق

---

(۱) صحیح مسلم

(۲) خصوصیت سے ملکنڈہ اے۔ پی۔ کے جناب ابن غوری صاحب نے اس کی اہمیت باور کرائی اور توجہ دلائی۔

اپنے گرانقدر تأثرات سے نواز کر کتاب کی اہمیت کو دوچند کیا اور حضرت ڈاکٹر صاحب کی دعوتی وتبلیغی زندگی کو اجاگر کر کے ناظرین کو بامقصد زندگی گذارنے کی دعوت دی۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضمون میں مدیر رسالہ ''الفرقان'' لکھنؤ کے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے متعلق تاثرات اور اس میں شائع شدہ حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے خطوط کی طرف جابجا اشارہ فرمایا تھا، اس طبع جدید میں وہ بھی شامل اشاعت ہیں، یہ خطوط صاحب خطوط کے لائق فخر برادر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مرتبہ ہیں، دو خط مزید شامل کردیئے گئے ہیں، ایک تو حضرت ڈاکٹر صاحب کا وہ خط ہے جو انھوں نے اپنے بڑے داماد جدّ مخدوم و مکرم گرامی منزلت جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب زید مجدہم کو اس وقت لکھا تھا جب وہ ملازمت کے لیے وطن سے دور بنگالہ گئے تھے، جس میں ملازم پیشہ لوگوں کے لیے نصیحت کا سامان ہے، دوسرا وہ اہم بلکہ تاریخی خط ہے جو انھیں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ نے اس وقت لکھا تھا جب وہ ان کے ہی ایماء پر ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام دینے بمبئی گئے تھے۔

برادر عزیز مولوی محمد اسحاق ندوی سیتاپوری (ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے ان تمام ترمیمات واضافوں کو خوش دلی سے کمپوز کیا، اور اس کے ناشر مخدوم گرامی جناب فضل الباری صاحب جنھوں نے خوش دلی سے منظور کیا، جس کے لیے ہم ان کے اور تمام محسنین ومعاونین کے شکر گذار ہیں کہ ''مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہ'' (حدیث) صلہ وجزا تو رب العالمین ہی دے گا اور خوب دے گا انشاء اللہ۔

کتاب کے جدید ایڈیشن میں مخدوم گرامی جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ العالی کا مقدمہ بھی ہے، جس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی مومنانہ

زندگی اور مصنف کے محققانہ مزاج وفلسفیانہ مذاق کا ذکر کیا ہے اور اس حیثیت سے بھی کتاب کی اہمیت وافادیت کو واضح کیا ہے، یہ ایک بیش قیمت اضافہ ہے اور گویا کتاب کی روح ہے، بارك الله في حياته ومتعنا الله والمسلمين بطول بقائه.

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کا نفع عام وتام فرمائے، اور تذکرہ نگار اور صاحب تذکرہ دونوں ہی کے درجات کو بلند تر فرمائے، اس کی ضرور حسرت ہے کہ کتاب کا جدید اضافی ایڈیشن اس وقت سامنے آرہا ہے جب صاحب تذکرہ کے بھائی بہنوں اور بیٹے بیٹیوں میں کسی کا بھی سایہ سر پر قائم نہیں رہا، وہ ہوتے تو حقیقی خوشی انہیں کو ہوتی اور یہی نہیں نواسوں اور نواسیوں میں بھی بعض اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے ہیں، جن میں ایک راقم السطور کی والدۂ ماجدہ بھی ہیں، جن کی فکر ودعا کا ایک ثمرہ یہ حقیر کاوش بھی ہے، اللہ تعالیٰ سبھی کے ساتھ عفو وکرم اور انعام واکرام کا معاملہ فرمائے، اور ہم سبھوں کو دین کے صحیح طریقہ پر چلائے، آمین۔

رقم کردہ
محمود حسن حسنی

پنجشنبہ، عاشورۂ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
۸؍جنوری ۲۰۰۹ء

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ
تکیہ کلاں - رائے بریلی

کچھ مؤلف کے بارے میں (☆)

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۴/ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ موافق ۱۱/اگست ۱۸۸۸ء کو بارہ بنکی میں ایک انصاری النسب خاندان میں پیدا ہوئے، والد بزرگوار حکیم عبدالخالق صاحب حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی (استاد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے تربیت یافتہ اور مجاز بیعت وارشاد تھے، خالص دینی مزاج اور ذوق تھا، انگریزی کے اتنے سخت مخالف تھے کہ جب مولانا عبدالباری صاحبؒ نے قیام ندوہ کے دوران انگریزی بھی پڑھنی شروع کی تو والد صاحب اس پر راضی نہ ہوئے، بلکہ اس کے لیے خرچ دینے سے بھی انکار کردیا، آپ انگریزی اس لیے پڑھنا چاہتے تھے کہ فلسفہ اور سائنس کو صحیح طور پر سمجھ سکیں، چونکہ ندوہ کے نصاب میں باقاعدہ یہ مضامین نہیں تھے، اس لیے آپ کے مشفق استاد علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس کے لیے آپ کی رہنمائی کی اور اس کا بندوبست کرایا، اور ماہانہ پندرہ روپئے وظیفہ مقرر ہوگیا۔(۱)

مولانا عبدالباری ندویؒ نے باقاعدہ تعلیم تو دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں حاصل کی، اس وقت دارالعلوم میں علامہ شبلی نعمانیؒ کا طلبہ پر گہرا اثر تھا اور طلبہ ان سے بڑے مانوس تھے، چنانچہ مولانا عبدالباری ندویؒ کا بھی علامہ موصوفؒ سے خاصہ قرب اور خاص تعلق ہوگیا، اور طرز تحریر مولانا شبلی کا پورا کا پورا لے لیا، شبلی القلم کہے جانے لگے، لیکن تربیت واصلاح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے یہاں

(☆) از مرتب
(۱) تفصیل کے ملاحظہ ہو "بزم اشرف کے چراغ" ص/۲۷۱ تا ۲۸۳، مرتبہ پروفیسر احمد سعید (مطبوعہ مصباح اکیڈمی لاہور۔)

رہ کر ہوئی تھی، اس لیے تھانوی الفکر کہے گئے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

''یہ لکھتے خوب ہیں، فکر و فہم حضرت تھانویؒ سے لیا ہے، اور انداز تحریر مولانا شبلیؒ سے۔'' (۱)

مولانا شبلی نعمانیؒ نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا اور سیرۃ النبی جیسی اہم کتاب کی تصنیف شروع کی کہ پیغام اجل آ پہنچا، اور آپ کے سب سے معتمد علیہ شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے استاد کی وصیت کے مطابق اس کام کے لیے مامور ہوئے اور اس کی تکمیل کے لیے پوری توجہ سے لگ گئے، جب معجزات کی بحث پر پہنچے تو اپنا قلم چلانے کے بجائے مولانا عبدالباری ندویؒ سے کہا کہ وہ لکھیں اس لیے کہ جدید فلسفہ پر بھی ان کی اچھی نظر ہے، چنانچہ اس موضوع پر آپ نے اپنا زوردار قلم چلایا، ماہر نقاد مولانا ماہر القادری لکھتے ہیں:

''سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد میں ''فلسفۂ جدیدہ اور معجزات'' کے عنوان پر سو صفحے مولانا عبدالباری ندویؒ کے لکھے ہوئے ہیں، سیرۃ النبیؐ کے اس حصہ کے ذریعہ راقم الحروف ان سے متعارف ہوا، اور فلسفہ کے ساتھ ان کی دینی وابستگی کا اچھا نقش میرے لوحِ دل و دماغ پر ثبت ہو گیا۔'' (۲)

مولانا عبدالباری ندویؒ ذہانت اور قابلیت میں بہت بڑھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود محنت و جانفشانی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا، ان کے پاس کسی یونیورسٹی یا بڑے کالج اور حکومت کا کوئی سرٹیفکٹ نہیں تھا کہ جس کے بل پر وہ کہیں آسانی سے ملازم ہو سکتے، صرف ندوہ کی سند تھی، اور انگریزی بقدر ضرورت سیکھ لی تھی، مولانا

---

(۱) معاصرین ص/۱۶۵، مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ۔

(۲) یادِ رفتگاں جلد دوم ص/۱۶، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

عبدالماجد دریا آبادی مرحوم سے آپ کا تعلق وارتباط بڑا قدیم رہا ہے، یہ دوستانہ تعلق زمانہ طالب علمی سے لے کر آخر عمر تک (تقریباً ٦٨ سال، جبکہ دونوں صاحب فراش ہو چکے تھے) رہا، فکر اور مزاج میں اشتراک تھا، علم وادب کے شیدائی تھے، علامہ شبلی سے دونوں نے استفادہ کیا، مولانا مدنیؒ کے ہاتھ پر دونوں نے ایک ساتھ بیعت کی اور تربیت واصلاح مولانا تھانویؒ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی، علاقائی رشتہ بھی تھا، اور دور کا عزیزانہ تعلق بھی، ابھی دونوں طالب علم ہی تھے، ایک کیننگ کالج لکھنؤ میں اور دوسرے ندوہ میں، ایک کو عربی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، اور دوسرے کو انگریزی، مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ لکھتے ہیں:

"میں نے کورس میں عربی لی تھی، انھیں پرائیویٹ انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، میں نے ان سے عربی کچھ سبقاً سبقاً پڑھی اور انھوں نے مجھ سے انگریزی، مجھے تو کچھ عربی آئی وائی نہیں البتہ انھوں نے انگریزی مطالعہ بھر کی ضرورت کی سیکھ لی۔" (۱)

ذہانت وقابلیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ دکن کالج پونا میں جو اس وقت پورے ملک میں بڑا نام اور شہرت رکھتا تھا، بحیثیت فارسی کے لکچرار کے ان کا تقرر ہوا، اور انھوں نے بجائے فارسی یا اردو کے درجہ میں انگریزی میں لکچر دینا شروع کیا، اور دیوان حافظ جیسی بلند پایہ اور رموز وتلمیحات سے بھری ہوئی کتاب کو انگریزی میں حل کر کے طلبہ کے سامنے پیش کرتے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

"ان کا یہ تجربہ بی.اے. میں بھی کامیاب رہا اور طلبہ ہر طرح سے مطمئن ہوئے۔" (۲)

---

(۱) معاصرین، ص/۱٦۴، مولانا دریابادی نے اپنے متعلق جو لکھا ہے وہ ازراہ تواضع کہا ہے ورنہ وہ عربی زبان کا اچھا ذوق وفہم رکھتے تھے۔
(۲) پرانے چراغ جلد دوم ص/۱۱۷۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم اصول وضوابط کے سخت پابند تھے اوراس سلسلہ میں وہ کسی سے سمجھوتہ پسند نہیں کرتے تھے اوراپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونے دیتے تھے، دکن کالج پونا میں رہے ہوں(ا) یا گجرات کالج احمد آباد میں، گجرات کالج احمد آباد میں آپ نے ''مذہب اور عقلیات'' کے موضوع پر ایسا لکچر دیا کہ جس سے آپ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور بہت مقبول ہوا، مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے اس لکچر کو جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا ''بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر'' سے تعبیر کیا، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کو ''اسلام کا آہنی قلعہ'' قرار دیا۔

بعض وجوہات کی بنا پر مولانا کو یہاں سے بھی علاحدہ ہونا پڑا، اور ایک سال آپ کا خالی گذرا، اس دوران مولانا سید سلیمان ندویؒ نے آپ سے کافی اصرار کیا کہ دارالمصنفین آجائیں کہ نہ یہاں ملازمت ہے نہ افسری اور نہ ماتحتی، مگر ایسا نہ ہوسکا، اور آپ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد گئے اور شعبہ فلسفہ کی صدارت بھی آپ کے سپرد ہوگئی، اعتراض کرنے والوں کو اعتراض اس بات پر ہوا کہ فلسفہ کی سند تو درکنار کوئی دوسری سند بھی نہیں ہے اور یہ صدر شعبہ ہیں، تو اس وقت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ نے حضور نظام کی خدمت میں یہی رسالہ ''مذہب اور عقلیات'' اس تحریر کے ساتھ پیش کیا کہ ''ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا ہے۔''

جامعہ عثمانیہ میں آپ نے اپنے فرائض منصبی کس طرح ادا کیے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

(ا) دکن کالج پونا میں علامہ سید سلیمان ندوی لکچرار تھے، اسی اثناء میں جب مولانا شبلی نعمانیؒ کا سانحۂ وفات پیش آیا اور تکمیل سیرت النبیؐ کے لیے حضرت سید صاحب کو مستقلاً دارالمصنفین میں قیام کرنا پڑا تو دکن کالج میں انھوں نے اپنی جگہ مولانا عبدالباری ندوی کا نام پیش کیا جو اس وقت کے صدر شعبہ فارسی سر عبدالقادر کی کوششوں سے کئی ایم. اے. کی سند یافتہ لوگوں کے مقابلہ میں منظور ہوا، اور آپ کی حسن خدمات سے لوگ متاثر بھی رہے لیکن کچھ عرصہ بعد بعض وجوہات کی بنا پر احمد آباد تبادلہ کردیا گیا، ملاحظہ ہو: بزم اشرف کے چراغ (بحوالہ سابق ص/۲۷۴)

> ”اپنے فرائض منصبی نہ صرف کامیابی اور نیک نامی سے ادا کئے بلکہ علماء کی خودداری، خودشناسی اور ذہنی واخلاقی بلندی کا نقش بھی قائم کردیا، ایک مرتبہ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن جامعہ کے معائینہ کے لیے آئے تھے، مولانا عبدالباری ندویؒ نے ان کو اپنے کلاس کی طرف آتے دیکھا تو لڑکوں سے کہا ”دروازہ بند کردو، میں ایک بار ندوہ کا امتحان دے چکا ہوں، بار بار امتحان نہیں دیتا۔“ وہ یہ دیکھ کر واپس چلے گئے۔“(۱)

مولانا عبدالباری ندویؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے دیرینہ تعلقات اسی جامعہ کی بدولت ہیں،(۲) ان دونوں فاضلوں اور ہم مذاق دوستوں (جن کے مقصد وفکر میں اشتراک تھا) کی یکجائی نے ایسا دلکش علمی، ادبی، دینی ماحول اور خوشنما منظر پیدا کردیا تھا کہ جس کا اثر ان کے شاگردوں اور حاضر باشوں میں برابر قائم رہا، اور اس کی یادتازہ رہی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ان ایام کو ”قران السعدین“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اصلاحی تعلق کی داستان بھی عجیب اور طویل ہے، ضروری نہیں کہ

---

(۱) پرانے چراغ، ص/۱۱۹۔

(۲) مولانا سید مناظر احسن گیلانی آپ کے بڑے معترف اور قدرداں تھے، ایک دوست اور معاصر کی قدردانی اور اعتراف معنی خیز ہے، وہ علامہ سید سلیمان ندوی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ”آپ کو اور مولانا عبدالباری کو دیکھتا ہوں تو شعر یاد آتا ہے:

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا ☆ ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

اور کیا عرض کروں مولانا عبدالباری کا حال حدود رشک سے آگے نکل گیا ہے، اب میرے نزدیک تو وہ اچھے صاحب دل بزرگ ہیں، کثّر اللہ امثالہم۔“

اور ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں: ”مولانا عبدالباری صاحب کی حالت دن بدن بہت زیادہ قابل رشک بنتی جارہی ہے، میں تو ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پارہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں۔“ (تعمیر حیات جلد ۱۳ شمارہ ۷-۸ بحوالہ مکاتیب گیلانی، ص/۲۲۵ تا ۲۳۰۔)

ہر بات لکھی جائے، ہاں یہ ضروری ہے کہ کچھ روشنی ڈالدی جائے، اس لیے کہ اس کے بغیر آپ کا سوانحی خاکہ ناقص و نامکمل ہے، ہمیں یہ بات مناسب اور راجح معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنی زبان یا کسی دوسرے کی زبان سے اس سلسلہ میں کچھ ذکر کریں، خود مولانا عبدالباری ندویؒ کا قلم کیا کہتا ہے، پیش کیے دیتے ہیں، مولاناؒ لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے میرے کم و بیش ساٹھ سال کے تعلقات ہو چکے ہیں، اچانک ایک دن ان کو کسی سے بیعت ہونے کا خیال آیا، احقر کے تعلقات ان سے اتنا زیادہ تھے کہ وہ اس راہ میں بھی رفیق طریق بنانا چاہتے تھے، ان کا رجحان مولانا مدنیؒ کی طرف ہوا، اور ان سے دونوں کا بیعت ہونا طے ہو گیا، جب ہم لوگ دیوبند اسٹیشن پر پہنچے تو دیکھا مولانا تشریف فرما ہیں اور ڈبہ کا دروازہ کھلتے ہی بجائے قلی کے خود ہی ہم لوگوں کا سامان اٹھا لینا چاہا، کچھ طلبہ بھی ساتھ تھے، انھوں نے حضرت سے لے جا کر تانگہ پر رکھ دیا، اور ہم دونوں کو مولانا کے ساتھ بٹھا دیا، اس زمانہ میں آپ کا قیام حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر تھا، ہم لوگوں کو بھی وہیں ٹھہرایا، اور جس مدعا کے لیے حاضر ہوئے تھے اس کی نسبت فرمایا کہ میں اس کے لائق بالکل نہیں ہوں، تم دونوں کو مولانا تھانویؒ سے بیعت ہونا چاہیے، ماجد میاں نے برجستہ اپنی ذہانت کا ثبوت دیا، اور عرض کیا کہ حضرت سنا ہے کہ اس راہ کا پہلا قدم تو خودرائی کو فنا کرنا ہے، اور ہم پہلے قدم میں آپ کی مخالفت کریں گے تو آگے کیا چلیں گے، مگر مولانا نے اس قسم کے سارے معروضات سنے ان سنے فرما دیئے، اور دوسرے ہی دن

غالباً پہلی گاڑی سے ہم دونوں تھانہ بھون پہنچے، حضرت تھانویؒ نماز کے بعد فارغ ہوئے ہی تھے کہ نظر حضرت مدنیؒ پر پڑی، پھر ان کو ساتھ لے کر اپنی مستقل نشست گاہ سہ دری میں تشریف فرما ہو گئے، اور جلد ہی ہم دونوں کی حاضری کا ارشاد ہوا، حاضری پر دیکھا تو دونوں میں گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ ہر ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا بلکہ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ میں ان کے لائق نہیں، آپ ہی قبول فرمالیں، چند منٹ کے لیے دونوں حضرات نے تخلیہ بھی فرمایا، اس کے بعد پھر ہمارے حضرت مدنیؒ اپنی ہی درخواست فرما رہے تھے، چنانچہ حکیم الامت قدس سرہ نے اپنے حکیمانہ رنگ کا جواب دے کر معاملہ ختم فرمایا کہ نہ تو میں جنید و شبلی ہوں اور نہ ہی آپ، ان کے لیے دونوں ہی کافی ہیں، مگر ان کو مناسبت آپ سے زیادہ ہے، اس لیے ان کو آپ ہی اپنے ساتھ لے جائیں، مناسبت کا اندازہ حضرت نے شاید اس طرح فرمایا کہ ماجد میاں تو اس وقت اپنے محبوب و ممدوح مولانا محمد علی (۱) مرحوم کے کھدری لباس میں سر سے پیر تک ملبوس تھے اور شاید اس وقت رائج الوقت کھدر کی ٹوپی میرے سر پر بھی تھی، دیوبند واپسی پر حضرت مدنیؒ نے ہم دونوں کو بیعت فرمالیا۔'' (۲)

---

(۱) تحریک خلافت اور آزادی ہند کے فعال کارکن ہی نہیں بلکہ رہنما مولانا محمد علی جوہر مراد ہیں، ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو وفات پائی اور قدس میں مدفون ہوئے۔

(۲) بزم اشرف کے چراغ ص/۲۷۶-۲۷۷، یہ کتاب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء کے حالات کا مجموعہ ہے، جسے پروفیسر احمد سعید صاحب نے مرتب کیا ہے، کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ خلیفہ کے حالات خود اس کے قلم سے ہوں، مولانا عبدالباری ندوی بیعت تو حضرت مدنیؒ سے تھے، لیکن مدارج سلوک حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے یہاں طے کیے، اور وہیں سے سند بھی عطا ہوئی۔

بیعت کا تعلق تو ضابطہ سے حضرت مدنیؒ سے ہوگیا لیکن تربیت واصلاح کا تعلق اور صحبت حضرت تھانویؒ کی ہی رہی، باوجود مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے وقت نکال کر تھانہ بھون حاضری دیتے اور استفادہ کرتے، بالآخر اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے، لیکن اس کے ساتھ مولانا مرحوم نے حضرت مدنیؒ کی عقیدت وعظمت میں فرق نہ آنے دیا، اوراس بات کی کوشش کرتے کہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں بھی حاضری دیتے رہیں، حضرت مدنیؒ کو بھی مولانا سے خصوصی تعلق رہا چنانچہ لکھنؤ آمد پر حضرت مدنیؒ کا معمول اپنے مسترشد خاص وارشد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے مکان پر قیام کا رہتا تھا، اس کے علاوہ اگر کہیں قیام کو پسند فرماتے تو مولانا عبدالباری ندویؒ کے یہاں، اور منشرح رہتے۔

مولانا عبدالباری ندوی حضرت تھانویؒ کے رنگ میں رنگ گئے تھے، آپ کی تعلیمات کو اپنی تحریر میں لاکر لوگوں کے سامنے پیش کیا، سلسلۂ تجدید کی کتابیں اس کی شاہکار ہیں، اس کے علاوہ آپ نے متعدد اہم کتابیں لکھیں، آخر میں ان کتابوں میں ''مذہب اور سائنس'' کو خاص امتیاز حاصل ہوا، اور بعض اہم انگریزی کتابوں کو اردو کا جامہ بھی پہنایا اور مقبول ہوئیں۔

آخر میں برابر بیمار رہنے لگے تھے، پھر ایسے ہوئے کہ بالکل صاحب فراش ہوگئے، اور چند سال اسی طرح گذرے، بالآخر ۳۰؍جنوری ۱۹۷۶ء موافق ۲۸؍محرم ۱۳۹۶ھ کو وقت موعود آگیا، وصیت کے مطابق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور ڈالی گنج قبرستان لکھنؤ میں تدفین عمل میں آئی، رحمہ اللہ رحمة واسعة وغفرله مغفرة تامة.

صاحبِ تذکرہ

ایک سوانحی تعارف(☆)

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ ۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ (۱) مطابق یکم دسمبر ۱۸۹۳ء کو اتوار کے دن ضلع فتحپور (یوپی) کے ایک تاریخی قصبہ ہنسوہ میں پیدا ہوئے، جو آپ کا نانیہال تھا، آپ نسباً حسنی تھے، سلسلۂ نسب حضرت محمد ذوالنفس الزکیۃ الشہید بن حضرت عبداللہ المحض بن حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہوتا ہے۔

آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ مصنف ''گل رعنا'' اور ''نزہۃ الخواطر'' عالم زاہد وصالح شخص تھے، علمی میدان میں بہت بلند پایہ مقام کے حامل ہونے کے ساتھ صلاح وتقویٰ میں امتیاز و درجۂ کمال حاصل تھا، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے اجازت یافتہ تھے، ۱۹۱۵ء میں بالاتفاق ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے، اور ۱۹۲۳ء میں دار فانی سے دار بقا کو کوچ کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ وغفر لہ۔

والدہ ماجدہ مولانا سید عبدالعزیز صاحبؒ کی صاحبزادی تھیں، جن کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا حسین سبط الرسولؐ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے، ابھی ڈاکٹر صاحب کی عمر آٹھ سال کی ہی تھی کہ والدہ مخدومہ سیدہ زینب بی بی رحلت فرما گئیں، رحمہا اللہ تعالیٰ وغفر لہا، ماموں مولانا سید ابوالقاسم صاحب عالم صالح اور ولی صفت شخص تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تربیت یافتہ اور مرید خاص رہے، انھیں بھی حضرت

(☆) از: مرتب (۱) اسی سنہ میں ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہوا اور اس کی تاسیس عمل میں آئی۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور بعض دوسرے مشائخ طریقت سے اجازت وخلافت حاصل تھی، ان کے دادا اور مولانا عبدالحی حسنی کے نانا مولانا سید سراج الدین ہنسوی حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدین باکمال اور مجازین میں تھے، جن کے تربیت یافتہ لوگوں میں ایک اہم نام ان ہی کے بھتیجے مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسوی کا ہے(۱) جن کا شمار سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے نامور مشائخ اور علمائے راسخین میں ہوتا ہے، اور مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی کے خسر بھی تھے۔(۲)

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے بچپن کا بیشتر حصہ ننیہال (ہنسوہ ضلع فتحپور) میں اور پھر ددیہال (تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) میں گذرا، آپ کے جد بزرگوار مولانا حکیم سید فخرالدین خیالی صاحب بذات خود بڑے باکمال اور نامور مصنف شاعر صوفی اور حضرت امیر المؤمنین سیدنا سید احمد شہیدؒ کے بیک واسطہ خلیفہ مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی کے خلیفہ ومجاز تھے، ان کے سایۂ عاطفت میں ڈاکٹر صاحبؒ کے مبارک ایام گذرے اور علم سیکھا۔

تسمیہ خوانی ہنسوہ میں ہوئی، قرآن کریم اور اردو وفارسی کی ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں حاصل کی، جہاں مولانا عبدالحکیم کیرانوی صاحب (جن کا روحانی تعلق حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اور شرف تلمذ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ، علامہ کیرانویؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے تھا) قیام فرما تھے، ان کے پاس مکتب نشینی کی، چنانچہ آپ کو ان دونوں جگہ علمی وروحانی ماحول میسر آیا، جہاں آپ نے نیک صحبتوں

---

(۱) مولانا شاہ عبدالسلام ہنسوی کے خلفاء میں مولانا شاہ نجم الدین فتحپوری اور مولانا ناظر علی کاکوروی کا نام بہت نمایاں ہے، مولانا ناظر علی کے صاحبزادے امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی کے پوتے جن سے شیعی اثرات اور بدعات وخرافات کے ازالہ کا کام بڑے پیمانہ پر ہوا، اور انھوں نے اس تعلق سے تجدیدی خدمات انجام دیں۔

(۲) مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی مولانا حکیم سید فخرالدین خیالی کے بھانجے تھے اور ان کا پہلا نکاح تکیہ رائے بریلی کے حسنی سادات میں ہوا تھا، دوسرا نکاح ہنسوہ کے حسینی سادات میں مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسوی کی صاحبزادی سے ہوا۔

اور سنجیدہ وادب آموز مجلسوں کے مواقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کیں جو ایک مومن کامل کے شایان شان اور ایک عالم ربانی کے لیے ضروری ہوتی ہیں، آپ کے والد ماجدؒ جو ایک بڑے نباض، عالم، عارف، حکیم تھے، برابر آپ کو خطوط کے ذریعہ تعلیمی ہدایات کرتے رہتے اور ایک ایک چیز کی برابر خبر رکھتے، پھر والد صاحب کے پاس لکھنؤ آگئے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے کسب فیض کیا، تمام اساتذہ آپ کا بڑا خیال رکھتے، یہاں سے تکمیل تعلیم کے بعد والد صاحبؒ کی ایما پر دار العلوم دیوبند گئے، جو اس وقت درس حدیث کا ایک بڑا مرکز تھا، ایک طرف شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اسیر مالٹا مسند آرا تھے، تو دوسری طرف علم حدیث میں امام وقت علامہ انور شاہ کشمیری رونق افروز تھے، اول الذکر سے آپ نے صحیح بخاری اور سنن ترمذی کا درس لیا، اور ثانی الذکر سے ابوداؤد شریف پڑھی، اور دونوں ماہرین فن شیوخ کے درس کی تقریریں بحسن وخوبی عربی زبان میں قلمبند کرتے جاتے تھے، افسوس کہ کسی نے استفادہ کے لیے لیا اور پھر واپس نہیں کیا جس کا حضرت ڈاکٹر صاحب کو صدمہ رہا۔

علم دین کی تکمیل کے بعد طب کی طرف میلان ہوا، والد صاحب کی بھی خواہش تھی اور آپ کے لیے یہ ایک خاندانی علم تھا، چنانچہ آپ نے والد صاحب سے طب کی تمام متداول کتابیں پڑھیں، پھر والد ماجد کے ایما سے ہی حاذق الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں دہلی گئے اور جلد ہی ان کے یہاں اعتماد پیدا کرلیا، اس کے ساتھ ساتھ نامور ڈاکٹر اور عظیم مجاہد آزادی وقائد ملت ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱) سے بھی استفادہ کرتے جاتے تھے، وہاں سے واپسی پر انگریزی تعلیم کا شوق پیدا ہوا، حالانکہ اس وقت آپ کی شادی ہوچکی تھی، اور بیس بائیس سال عمر تھی، لیکن اپنی

(۱) اب جبکہ کتاب کا جدید ایڈیشن پیش نظر ہے، ان ہی انصاری صاحب مرحوم سے خاندانی نسبت رکھنے والے ڈاکٹر حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز ہیں۔

صلاحیت واستعداد سے اتنی انگریزی بھی سیکھ لی کہ سنٹی نیل اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ کرالیا، جہاں تعلیم کا معیار خاصہ بلند تھا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی وضع قطع، لباس ومعمولات میں کسی قسم کا ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا، پوری شرعی داڑھی، شرعی کرتا و پائجامہ، اپنے وقت پر نمازوں کی پابندی وغیرہ امور دیگراں، اساتذہ آپ کا پورا لحاظ اور طلبہ پورا احترام کرتے تھے، آپ تعلیم میں برابر ترقی کرتے گئے، بی. ایس. سی. (B.S.C.) میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور وہاں بھی اپنے احوال ومعمولات میں کسی قدر بھی فرق نہ آنے دیا، امتحان ہال میں نماز کا وقت آگیا، وہیں شیروانی بچھائی اور نماز شروع کردی، جس پر امتحان ہال کے نگراں کو معذرت بھی کرنی پڑی، ۱۹۲۵ء میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں M. B. B. S. کا کورس مکمل کیا اور کامیابی حاصل کی، اور اس کے بعد سے والد صاحب کے مطب کے قریب مطب کرنا شروع کردیا، اہم بات یہ ہے کہ میڈیکل کالج میں آپ زیر تعلیم ہی تھے کہ شفیق باپ، مشفق مربی دنیا سے رخصت ہوگئے، اس اچانک حادثہ کا آپ پر بڑا گہرا اثر پڑا، سوئے اتفاق کہ اس موقع پر آپ یہاں موجود بھی نہ تھے، بلکہ میڈیکل کالج ہی کی طرف سے آپ مدراس گئے ہوئے تھے، اس چیز نے اور متاثر کیا، ڈاکٹر صاحب اپنے والد کے بڑے محبوب وعزیز فرزند تھے، اور اپنے والد ماجد کی حکم برداری، اطاعت، حسن سلوک میں بڑے ممتاز تھے۔(۱)

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے سانحۂ ارتحال سے جہاں آپ کو عظیم صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، وہیں آپ پر ایک ساتھ دوہری ذمہ داریاں آپڑیں، آپ پر بوجھ اس بات سے اور بڑھا کہ والد علیہ الرحمہ نے ترکہ میں صرف ایک روپیہ چھوڑا، جو ان کے زہد عن الدنیا اور دین کے کاموں میں لوجہ اللہ خدمت کی نشاندہی

(۱) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "حیات عبدالحی" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ کراچی وپونا، دہلی و رائے بریلی۔

کرتا ہے(۱) حضرت ڈاکٹر صاحب کو ایک طرف اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی فکر اور ذمہ داری اور دوسری طرف اپنی دو چھوٹی بہنوں اور عزیز بھائی (یہ تینوں مولانا عبدالحی کی زوجۂ ثانیہ سے ہیں) کی فکر اور ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری، اسے کس طرح ادا کریں اور نبھائیں، ڈاکٹر صاحب ہر معاملہ میں پہلے دین وشریعت کو دیکھتے تھے، اور اسوۂ نبویہ کو نمونہ جانتے تھے، چنانچہ آپ نے جس انداز وطریقہ سے یہ عظیم ذمہ داری نبھائی اور یہ مشکل کام بحسن وخوبی انجام دیا، کہ یہ چھوٹے بھائی جن کا نام ابوالحسن علی تھا، وہ اس وقت اسلام کے عظیم مفکر مصلح اور داعی، عالم ربانی اور امام کی حیثیت سے عالم اسلام میں متعارف ہیں، اور صرف متعارف ہی نہیں بلکہ عرب وعجم ان کے گرویدہ ہیں، اور ان کی تحریر وتقریر کا لوگوں پر گہرا اثر ہے، دونوں بہنیں بھی اپنے خانوادہ میں علم وفضل اور صلاح وتقویٰ میں ممتاز رہیں۔

تعلیم وتربیت ومردم سازی کا ایک دوسرا حیرت انگیز نمونہ خود ان ہی کے فخر ہند فرزند مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے، جن کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر بعض اہل نظر نے "رجلٌ موھوبٌ" کہا اور جن کی بے نفسی، صلاح وتقویٰ کو دیکھ کر بعض اہل علم نے "فرشتہ صفت انسان" کہا، ان کے علاوہ خواہر زادگان میں مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی ومظاہری، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے وہ مبارک اسماء ہیں کہ جن کے فیوض وبرکات سے بھی ایک عالَم مستفید ہو رہا ہے، دین اور دین کا علم خود ہی سکھایا، انھیں اس مسئولیت کا ہر ہر لمحہ پورا خیال رہا، جس کا حدیث نبویؐ میں ذکر آیا ہے کہ "ألا کلّکم راعٍ وکلّکم مسئول عن رعیتہ." اولاد کی تعلیم وتربیت سے متعلق ان کی ہی ایک صاحبزادی

(۱) آپ کی ایک صفت یہ تھی کہ دن بھر کی آمدنی شام تک خرچ کر دینا ضروری سمجھتے تھے، اور رات کو باقی رکھنا برا جانتے تھے، اسی وجہ سے آپ پر کبھی زکوۃ فرض نہیں ہوئی، اور ترکہ وجائیداد میں کچھ نہیں چھوڑا۔ (حیات عبدالحی ص/۲۴۷)

(والدہ مولانا سید محمد حمزہ حسنی مدیر ماہنامہ رضوان لکھنؤ) کی تحریر ملاحظہ ہو:

"میرے والد صاحب ایک مشہور طبیب اور بڑے فاضل و عالم تھے، ان کو خدا نے اولاد کی تربیت کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، انھوں نے اپنی ساری اولاد کی تعلیم و تربیت کا بخوبی انتظام کیا اور ان کو اردو عربی کی تعلیم دی، اور رفتار و گفتار پر ہر وقت نظر رکھی، جو غلط بات دیکھتے تو محبت و شفقت کے ساتھ متنبہ فرما دیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی غیوبیت میں بھی کوئی بری بات کرتے طبیعت جھجکتی اور برائی سے نفرت پیدا ہو جاتی، میری والدہ صاحبہ مرحومہ کو بھی علم دین سے حد درجہ لگاؤ تھا، وہ اکثر و بیشتر "طریق النجاۃ" (ترجمہ مشکوۃ المصابیح) پڑھا کرتیں، جب وہ کھانا کھا کر قیلولہ کرتیں تو اپنے ہاتھوں میں "طریق النجاۃ" لے لیتیں اور پڑھتی رہتیں، اسی طرح تسبیح پڑھنے کا بھی اہتمام کرتیں، ہم سب بھائی بہنوں پر کڑی نگاہ رکھتیں اور غلط جگہ بیٹھنے پر بیکار کاموں کے کرنے سے روکتیں، والدین کے اسی طریق تعلیم و تربیت کے تحت میری پرورش ہوئی، اور میری تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

میری ذرا سی عمر بڑھی اور میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئی تو میرے والد صاحب قبلہ نے میرے لیے ایک استاد کا انتظام کیا، وہ مولوی صاحب بڑے دیندار اور صاحب علم تھے، وہ روز تشریف لاتے اور خوب سمجھا سمجھا کر پڑھاتے، جن کی تعلیم گھر کرتی چلی گئی، میں نے کلام پاک انھیں مولوی صاحب سے ختم کیا، کلام پاک کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی "بہشتی زیور" اور فارسی

پڑھنی شروع کی، اردو میں بہشتی زیور سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا، درحقیقت بہشتی زیور میں مسائل کے علاوہ بھی بہت سی گھریلو زندگی میں کام آنے والی چیزیں اور چٹکلے نیز علاج ومعالجہ کی باتیں معلوم ہوئیں، جنھوں نے مجھ کو بہت فائدہ پہنچایا، بہشتی زیور کے علاوہ مولانا عبدالحی حسنی صاحب کی ایک مختصر سی کتاب روزمرہ کام آنے والے مسائل پر ہے، وہ بھی میں نے پڑھی، انھیں مولانا عبدالحی صاحب کی دوسری کتاب جو بچوں کے لیے لکھی ہے، جس میں سوالات وجوابات کے انداز میں ایمان وعقیدہ، اعمال اور سیرت نبویؐ پر بیان ہے، ان کتابوں کے علاوہ مفتی کفایت اللہ صاحب کی مشہور کتاب ''تعلیم الاسلام'' کے تمام حصے بڑے شوق وذوق سے پڑھے اور ان سے بہت سے مسائل معلوم ہوئے، اور برابر کام آتے رہے۔

ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی مخصوص سورتیں جیسے سورۂ یٰسین، سورۂ رحمٰن، سورۂ واقعہ، سورۂ فتح، سورۂ تبارک الذی یاد کیں، اس لیے کہ ان سورتوں کی فضیلتیں اور ان کے پڑھنے کا ثواب اپنے والدین اور بزرگوں سے برابر سنتی آتی تھی، یہاں تک پہنچی تھی کہ میرے استاد سے پردہ ہوگیا، اور میری عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ اب گھر کے اندر ہی پڑھنے لگی، میرے والد صاحب جن کو خدا نے دینی ودنیوی علوم سے بخوبی نوازا تھا، مجھ کو خود پڑھانے لگے، اور عربی شروع کرادی، سب سے پہلے ''حکایات الاطفال'' پڑھائی، اس کے بعد بعض دوسری عربی

کتابیں، عام مطالعہ میں میں نے سیرت عائشہ، الصالحات، اسوۂ صحابیات، اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث کی حکایات صحابہؓ رکھی، نیز سیر الصحابیات اور مولانا حالی کی مسدس اور چپ کی داد، اور اقبال مرحوم کی ''شکوہ و جواب شکوہ'' مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' اور عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھی۔'' (۱)

ڈاکٹر صاحب کا روحانی واصلاحی تعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے تھا، اور یہ تعلق بڑا عقیدت مندانہ اور والہانہ رہا، حضرت مدنی کو بھی آپ سے بڑا خصوصی تعلق اور آپ پر بڑا اعتماد تھا (۲)، چنانچہ جب بھی لکھنؤ تشریف آوری ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے ہی مکان پر قیام فرما ہوتے، ورنہ اپنے مرید رشید حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کے مکان پر آرام فرما ہوتے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں قیام کا سلسلہ ۱۹۲۸ء سے تا وفات رہا، اور حضرت مدنیؒ کو اس میں کوئی تکلف نہیں تھا، کھانے میں بالکل سادہ پسند فرماتے تھے، ابھی حال میں حضرت مدنیؒ اور ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات کے ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی بڑی صاحبزادی محترمہ سیدہ حمیرا صاحبہ (رحمها الله تعالیٰ وغفر لها) کی وفات پر (جو ۳۰/ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ کو ہوئی) حضرت مدنیؒ کی اہلیہ مخدومہ (بارك الله في حياتها وأطال الله

---

(۱) ماہنامہ رضوان جولائی اگست ۱۹۶۷ء۔

(۲) راقم کو مولانا احرار الحق صاحب استاد دارالعلوم دیوبند کے حوالہ سے یہ بات پہنچی اور دوسرے شواہد اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو حضرت مدنیؒ کی طرف سے اجازت بیعت وارشاد بھی تھی دارالعلوم دیوبند کے ایک دوسرے مؤقر استاد مولانا قمر الدین صاحب گورکھپوری نے بھی اپنی رائے بریلی تشریف آوری پر ایسا ہی خیال ظاہر فرمایا، جب وہ ڈاکٹر صاحب کی قبر پر حاضر ہوئے تھے اگرچہ اس فہرست میں ان کا نام نہیں ہے جو ان کے خلفاء کی منظر عام پر آئی، والله أعلم بحقيقة الحال وإنهما لقيا بجوار ربهما الآن.

بقاء ھا) نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو جو تعزیتی مکتوب بھیجا ہے اس سے اس گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے، جو اس مرید صادق اور مرشد مخلص اور ان کے اہل خانہ کے درمیان تھا أبقاہُ اللّٰہ تعالیٰ، حضرت مدنیؒ دسمبر ۱۹۵۷ء میں دنیا سے رخصت ہوئے اور ڈاکٹر صاحبؒ نے یکم مئی ۱۹۶۱ء کو رحلت فرمائی، اللّٰھم اغفر لھم وارفع درجاتھم، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور ایک لمبی مدت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے حسین وجمیل تھے، خوش رو، خوش مزاج اور خوش دل تھے، رئیس احمد جعفری صاحب مرحوم کہتے ہیں:

"چہرہ سورج کی طرح روشن، دل آئینہ کی طرح صاف، خفا کبھی نہیں ہوتے، بڑی سے بڑی خطا خوشی سے معاف کردیتے ہیں۔"

مزید رقم طراز ہیں:

"گورا رنگ، دانت موتی کی طرح سفید، داڑھی کے بال بھورے تھے، اب سفید ہو چکے ہیں۔"(۱)

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ گویا ہیں:

"داڑھیاں اتنی خوشنما میں نے دو ہی دیکھی ہیں، ایک تو انھیں کی، دوسری مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی۔"(۲)

---

(۱) دید وشنید، ص/ ۲۱۷، مطبوعہ کراچی۔
(۲) معاصرین، ص/ ۱۴۸، مطبوعہ لکھنؤ۔

منظوم خراجِ عقیدت

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ

ڈاکٹر عبدالعلی سر تا بپا صدق و صفا — پیکر علم و عمل اخلاق و اخلاص و وفا
صورت وسیرت میں تھے اسلاف کی زندہ مثال — پاک رو روشن جبیں شیریں مقال وخوش خصال
ڈاکٹر کے ڈاکٹر اور ماہر طب قدیم — صاحب قلب و نظر تھے اور دانا و حکیم
خدمت مخلوق بھی یاد خدا بھی سر بسر — فیض کا دریا تھا جاری رات دن شام وسحر
عمر بھر وہ ہر کس و ناکس کے کام آتے رہے — وہ محبت کے ہر اک پر پھول برساتے رہے
ناظم ندوہ تھے وہ بیدار مغز و ہوشیار — گتھیاں سلجھائیں ندوے کی انھوں نے بیشمار
تیس سالہ دور ان کا تھا بڑا ہی شاندار — جو ملی ندوہ کو عزت ہے انھیں کی یادگار
وہ تھے شیخ الہند و انور شاہ کے تلمیذ خاص — ان پہ ان دونوں کی رہتی تھی ہمیشہ نظر خاص
نازش سادات و فخر خاندان اولیاء — ظلمت الحاد میں صبح ہدایت کی ضیاء
ان پر مولانا حسین احمد کی پرشفقت نظر — آتے جاتے ٹھیرنا رکنا ہمیشہ ان کے گھر
تھا پسند ان کو عمل رہ جس کو حاصل ہو دوام — ہر قدم پیش نظر تھی سنت خیرالانام
ان کی صحبت تھی شب تاریک میں نور سحر — ان کے فیض تربیت پر ہیں گواہ دیوار و در
دیکھنا ہو تم کو ان کی تربیت کا گر اثر — ڈالو مولانا علی(۱) پر اور محمد(۲) پر نظر
ان کی صحبت میں نہ جانے کتنے فاضل ہوگئے — جو تھے نا قابل نظر سے ان کی قابل ہوگئے
ہوگیا ان سے رواں علم و عمل کا کارواں — ان کا ہے ممنون احساں خانداں کا خانداں

ہے دعا اللہ سے ان کو کرے خلد آستاں
ان کو جنت میں ہو حاصل قرب ختم مرسلاں

(مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء)

---

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (ڈاکٹر صاحب کے بھائی)
(۲) مولانا سید محمد الحسنی ندوی (ڈاکٹر صاحب کے فرزند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾

فرشتہ صفت ہستی

کسی انسان کو جب پوری سچائی کے ساتھ فرشتہ یا فرشتہ صفت کہا جاتا ہے تو مطلب اس کی نیکی و معصومیت کا مبالغہ کے ساتھ اظہار ہوتا ہے، ورنہ کہنے والا خود اس کی کچھ نہ کچھ بشری کمزوریوں کو جانتا ہے، مگر اس کی معصومانہ فرشتہ صفتی کے مقابلہ میں وہ نظر انداز کرنے کے قابل ہوتی ہیں، اور کہنے والا جھوٹا نہیں خیال کیا جاتا ہے، بلکہ ایسا مبالغہ حقیقت واقعہ کو کما حقہ ظاہر کرنے کا ایک بلیغ عنوان ہوتا ہے، لیکن یہاں مدت العمر کے قریب سے قریب تجربات پر مبنی ایک ایسی ملکوتی ذات کا کچھ ذکر کرنا مقصود ہے جس کی نسبت بلا مبالغہ اور بلا تشبیہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ کے سوا کچھ کہا جائے، مراد حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کی شخصیت ہے، نوّر اللّٰہ مرقدہ ورفع درجاتہ۔

انسان کے فرشتہ ہونے کے لیے یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنے اختیاری اعمال وافعال میں چھوٹے بڑے معاصی ومنکرات سے بڑی حد تک محفوظ ہو، باقی قلبی خطرات پر نہ اس کا اختیار ہوتا ہے اور نہ مسئولیت ومواخذہ، لیکن حضرت مرحوم کی نسبت ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ میں حضرت گیلانیؒ کا کئی مہینے ان کے زیر علاج رہنے کے بعد یہ تاثر پڑھ لیا ہوگا کہ ''زندگی میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے قلب پر بھی

معصیت کا خطرہ نہ گذرتا ہوگا۔'' (۱) لیکن راقم احقر نے تو مہینوں کیا، سالہا سال کے گونا گوں تعلقات میں بھی اس کا تاثر کیا تجربہ میں روز افزوں ترقی ہی پائی، پھر جس قلب میں معصیت کا خطور تک بعید محسوس ہوتا ہو، اس کے قالب میں اس کے ظہور کا کیا سوال؟ آگے ایسے قلب وقالب کی شنیدہ سے زیادہ دیدہ کچھ ترجمانی ہے۔

تعارف، ملاقات اور تعلقات

ڈاکٹر صاحبؒ کی معصوم صورت کی نفس زیارت کے مواقع کوئی ۶۰ سال پہلے سے مل رہے تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے وہ باضابطہ طالب علم تو ایک دن بھی نہیں رہے تھے لیکن یہ نام نہاد ندوی جب ابتدائی درجوں میں تھا تو وہ نجی طور پر وہاں کے بعض استادوں سے پڑھنے کو آتے تھے، اس وقت بھی معصومانہ متانت کا رنگ یہ تھا کہ بس اپنے کام سے کام تھا، سیدھے سر جھکائے استاد کے پاس آتے، اور پڑھ کر چلے جاتے، کسی دوسرے طالب علم سے بات کرتے کم دیکھے جاتے، یاد نہیں ابتداء کیسے ہوئی اور ہوئی یقیناً میری طرف سے ہوگی، مگر ملنا جلنا اب سے تقریباً ۴۰ سال قبل اچھی طرح شروع ہوگیا تھا، اور تیس بتیس سال قبل تعلقات اتنے بڑھ چکے تھے کہ

---

(۱) مذکورہ تاثر خود صاحب کتاب مولانا عبد الباری ندوی مرحوم کا بیان کردہ ہے، جب ماہنامہ الفرقان کے ایڈیٹر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی آپ کی خدمت میں حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد اس لیے حاضر ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے متعلق صحیح واقفیت ہوسکے کیونکہ وہ ان کے رفیق خاص رہے ہیں، چنانچہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کی عرضداشت پر مولانا موصوف نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تاثر نقل فرمایا کہ:

> ''ایک مرتبہ حیدر آباد کے زمانہ قیام میں میری ہی تحریک پر علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا علاج شروع ہوا، یہ پہلی ملاقات تھی جو کافی ممتد ہوئی، واپس ہو کر مجھ سے کہا کہ میاں میں تمہارا شکر گذار ہوں کہ ایک ایسے آدمی کو دیکھنے کا موقع تم نے فراہم کیا، جیسا نہ اب تک ان آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ امید ہے کہ دوسرا دیکھنے میں آئے گا، میرا تو دل پورے یقین و وثوق سے کہتا ہے کہ اس شخص کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی نہیں گذرتا۔''
>
> (ملاحظہ ہو، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا ماہنامہ الفرقان میں مضمون ''ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ'' شمارہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

حضرت والد مرحوم حکیم عبدالخالق صاحب علیہ الرحمہ(۱) جب ۱۹۲۹ء میں نہایت تشویش ناک علالت کے حال میں حج سے واپس آئے تو ہفتوں مستقلاً و مسلسل ڈاکٹر صاحب کے ہی زیر علاج رہے،(۲) اب تعلق جس حد تک بڑھ چکا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ نہ فیس لینے کا خیال کرسکتے اور نہ میں باوجود پوری وسعت اور جی چاہنے کے پیش کرنے کی ہمت کرسکتا۔

ابتدائے علاج میں قریب قریب روز ہی زحمت فرمانا پڑتی، گرمیوں کا زمانہ تھا، بعض دن مطب کے بعد تشریف لاتے اور ٹھیک دوپہر میں واپسی کے بجائے والدؒ ہی کے کمرہ میں آرام فرماتے، اور عصر کے وقت تشریف لے جاتے۔

خیرخواہانہ مزاج

حضرت ممدوح (ڈاکٹر صاحبؒ) کو بہت قریب سے جاننے پہچاننے کی ابتداء والد مرحوم کے اس معالجہ کے دوران ہی سے ہوئی، پھر ان ۴۲ سالوں کی طویل مدت میں خاندان بھر کے اور سب سے بڑھ کر خود اس دائم المریض کے ایک معالج ہی کی حیثیت سے جیسے جیسے ان کے تجربات آخر وقت تک ہوتے رہے، اس کی مثال میں وہ آپ اپنی ملے، خود اپنی ہی بیماریوں میں پونا، بمبئی، احمد آباد (گجرات)

---

(۱) حکیم عبدالخالق صاحب علیہ الرحمہ (والد ماجد مولانا عبدالباری ندوی مرحوم) اودھ کے علاقہ بارہ بنکی کے قصبہ ''گدیا'' کے رہنے والے تھے، گھرانہ متمول اور خوشحال تھا، اور خود ذی وجاہت وحیثیت تھے، صلاح وتقوئی اور تدین میں بڑھے ہوئے تھے، حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ سے روحانی تعلق تھا، اور ان کے مرید خاص تھے، اور خلیفہ ومجاز بھی ہوئے، یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے والد حکیم سید عبدالحیؒ حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے تلمیذ خاص تھے۔

(۲) ۲۸-۱۹۲۹ء کا یہ سفر حج مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے ساتھ تھا، مولانا دریابادیؒ نے سفر حجاز کے نام سے تاثرات نامہ لکھا، جو کہ ایک ضخیم کتاب بن گیا، اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے دربار نبوتؐ کی حاضری کے نام سے اپنے جذبات کو سپرد قلم کیا، مولانا عبدالباری ندویؒ کی ایسی کوئی تحریر سامنے نہیں ہے، مگر ان لوگوں کے جذبات خود ان کے ہی جذبات ہیں، ساتھ یہ لوگ گئے اور ساتھ واپس ہوئے۔ (تفصیل کے ملاحظہ ہو، راقم کی تصنیف ''حیات عبدالباریؒ'' مطبوعہ مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ)

حیدرآباد اور دہلی و لکھنؤ کے جانے کتنے حکیموں اور ڈاکٹروں کے ہاتھوں پڑنا پڑا، مگر جیسی معالجانہ ذمہ داریوں اور ہمدردیوں کا اہتمام واحساس اپنے پرائے ہر ایک کے علاج میں ڈاکٹر صاحب کے اندر پایا، دوسری مثال علم میں نہیں آتی، بعض مریض مجھ سے سفارش چاہتے، تو کہتا کہ بھائی! ڈاکٹر عبدالعلی کو عام ڈاکٹروں اور حکیموں پر قیاس بالکل نہ کرو، نہ ان کے پاس تک کسی سفارش کی ضرورت ہے، وہ حسب ضرورت جتنی توجہ سے اپنے عزیز سے عزیز اور دوست سے دوست کو دیکھیں گے، اتنی ہی توجہ سے اجنبی سے اجنبی کیا دشمن سے دشمن کو بھی،

ذمہ داری کا احساس اور توجہ کے اسباب

ہاں جو مریض ان پر اعتماد اور ان کی ہدایات پر عمل جتنا زیادہ کرتا ہے اس کی طرف توجہ بھی آپ سے آپ اتنی ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔

خود میرے خاندان میں حضرات والدین مرحومین اور بہن سلمہا کو ان کے دست شفاء پر جتنا اعتقاد، اور دوا و پرہیز کا جتنا اہتمام تھا، دوسروں کو نہ تھا، اس پر کبھی کبھی طبیبانہ شفقت کی ناگواری بھی فرماتے کہ مثلاً وقت پر حال نہیں ملتا، (اسی طرح مریض کی کچھ اور کوتاہیاں ہوتیں) ورنہ بجائے خود اتنا خیال کہ کبھی وقت پر مناسب دوا ذہن میں نہ آتی تو فرماتے کہ سوچ کر یا کتاب دیکھ کر بتاؤں گا، پھر خود ہی بعض دفعہ کئی کئی دن کے بعد دوا تک بھجوا دیتے، فرماتے کہ ہومیو پیتھک کی دواؤں کا حال ایسا ہی ہے کہ بارہا ٹھیک دوا بروقت دماغ میں نہیں آتی، کتاب تک دیکھنا پڑتی ہے، تب سمجھ میں آتی ہے۔

کامیاب وہمدرد اور مجتہد معالج

علاج ومعالجہ ایک شریفانہ انسانی خدمت

جان وجسم کی حفاظت کی طبیبانہ ومعالجانہ خدمت بھی سب سے بڑی ذمہ دارانہ وشریفانہ انسانی خدمت ہے، مگر پیشہ ور ڈاکٹروں، حکیموں سب ہی نے اس کو اب کہنا چاہئے کہ نری دوکانداری بنا رکھا ہے، جہاں کسی کا نام زیادہ نکل گیا، تو مریض کے گھر جانے ہی کی فیس نہیں بڑھ جاتی، مطب میں بھی اتنی بندھ جاتی ہے کہ غریب وغرباء کیا متوسط درجہ کے مریضوں کی حیثیت سے بھی ان کا علاج کرانا طاقت سے باہر ہو جاتا ہے، پوری توجہ فیس ہی والے حاصل کر پاتے ہیں، قدرتاً بھی یہی ہونا چاہئے کہ بے فیس والوں کی بھیڑ کے مقابلہ میں فیس والوں کا حق زیادہ ادا ہو، اور تو اور اس دوکاندارانہ ذہنیت نے ایسے ذمہ دارانہ شریف پیشہ کو ایسا کمینہ بنا دیا ہے کہ اسپتال جن کے ڈاکٹر تنخواہ اسی کی پاتے ہیں کہ ان کی نظر مریضوں کے مرض کے سوا، ان کی جیب پر مطلق نہ رہے، ان میں بھی بہتوں کے متعلق آپ سنیں گے کہ اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی توجہ چاہتے ہو تو پہلے کم از کم ایک مرتبہ گھر پر فیس دے کر ضرور دکھا لو، نرسوں وغیرہ کی توجہ بھی کچھ اور نہ ہو تو کم از کم پھلوں وغیرہ تحفے تحائف تو چاہتی ہی ہیں، باقی نام کے ان عوامی اسپتالوں میں غریب عوام ہی کے ساتھ جان لیوا تک بے رحمیوں کے جو واقعات اتفاقاً اخباروں تک پہنچ جاتے ہیں وہ بھی فسادیوں کی ضرب المثل فسادات مات دینے میں کب پیچھے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا طریقہ کار

مرحوم ڈاکٹر صاحب کی اول روز سے جو قلیل فیس تھی، اس میں کسی اضافہ کا خیال وسوال کیا ہوتا، بعض اچھے کھاتے پیتے مریض اس کو ایسے حیلوں، بہانوں سے ٹال دیتے ہیں کہ گھر پر بھجوادی جائے گی، پھر یہی نہیں کہ نہ وہ بھجواتے نہ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے تقاضا ہوتا، بلکہ دوبارہ بلانے پر بھی خصوصاً جب مریض کی حالت کچھ سنگین ہوتو موصوف اتنے سنگدل کیسے ہوسکتے کہ محض فیس نہ ملنے کی بنا پر انکار فرمادیتے، مطب میں تنگدست مریضوں کو دوا تک مفت دی جاتی، اس سے بڑھ کر یہ کہ مستحق مریضوں کی دوا کے علاوہ بھی مدد فرماتے، اور کس کس طرح فرماتے، اس کی ایک شہادت ایک غیر مسلم شریف مسٹر ناتھ کی طرف سے وفات کے بعد ہی اخبار میں یہ چھپی تھی کہ:

> ''اس کے یہاں کسی مریض کو دیکھنے گئے تو فیس لینے کے بجائے دس روپیہ کا نوٹ چھوڑ آئے، وہ سمجھ گئے کہ یہ کام تو ڈاکٹر صاحب ہی کا ہے، واپس کرنے لوٹے، جواب کچھ اس قسم کا ملا کہ ''یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ نوٹ کس کام کے لیے اس نے آپ کے پاس بھیجا ہے، مجھ کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔''

اللہ اللہ! اللہ پر نظر بندہ کی نظر کو کہاں سے کہاں پہنچادیتی ہے، ایک اسپتال میں پڑے ہوئے مریض جس کی بے تنخواہ کی رخصت نے اہل وعیال کو فاقہ کشی تک پہنچادیا تھا، عین اپنے مرض الموت کی طویل علالت کے دوران دواؤں وغیرہ سے ہی سے نہیں، نقد سے خود راقم ہٰذا کے علم میں سیکڑوں کی مدد کرتے کراتے رہے۔

معالجانہ دیانتداری کا عالم یہ ہے کہ اگر کسی مریض کو معتد بہ مدت تک نفع نہ

ہوتا یا اپنی تشخیص وتجویز پر اطمینان نہ رہتا، تو بے تکلف فرمادیتے، کہ کسی دوسرے کو دکھلالو، بلکہ کبھی کبھی خود ہی دوسرے کا نام بتلادیتے، خود میری علالتوں اور آخر میں بڑی لڑکی سلمہا کی ممتد حرارت میں متعدد ایسے حادثے پیش آئے، اس کی حرارت کو کم وبیش ایک سال ہو چکا تھا، ٹوٹ نہیں رہی تھی، فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیسی حرارت ہے، کسی اور کو دکھلانا چاہیئے، کس کو؟ اب مشورہ کی ذمہ داری دیکھئے، خود گومگو میں پڑ گیئے، دیر تک سوچتے رہے، لکھنؤ جیسے شہر میں اچھے اچھے نامی ڈاکٹر حکیم سب ہی موجود، بعض نامی ڈاکٹروں کا نام خود میں نے لیا، تو ایک کی نسبت جو بڑے لیڈر بھی ہیں، فرمایا کہ "ڈاکٹر کو تو صرف ڈاکٹر ہونا چاہیئے" مستقل دوسری مصروفیات رکھنے والا معالج مریضوں کی طرف پوری توجہ کا حق ادا نہیں کرسکتا، نہ وقت ملنا آسان ہوتا ہے، معالج کیا کوئی بھی مستقل، متعدد ومتنوع ذمہ داریاں قبول کرکے منقسم وناقص توجہ کے ساتھ کسی ایک کا بھی پوری ذمہ دارانہ توجہ کے ساتھ حق کیسے ادا کرسکتا ہے؟ ایک دوسرے بڑے مشہور ڈاکٹر ہی کا نام میں نے ہی لیا، تو فرمایا: وہ خود اب ایسے مریض ہیں کہ دماغ صحیح طور پر کام نہیں کرتا بعض دفعہ بہت سنگین غلطی کرجاتے ہیں، مگر روپئے کی خاطر مطب نہیں چھوڑتے، حالانکہ لاکھوں کما چکے اور جمع ہے، پھر سوچ ساچ کر ایک تیسرے نسبتاً کم نامی کا مشورہ خود ہی دیا، ان کے متعلق معلوم ہوا کہ فیس تو گھر پر بھی اور ایک ہی نہیں مختلف ٹسٹوں کی الگ الگ بھرپور لیتے ہیں، نسخہ بھی دس بیس روپئے تک کا بے تکلف لکھ دیتے ہیں، زیادہ تر علاج ان کا بڑے آدمی ہی کرتے ہیں، میں نے کہا کہ یہ علاج تو میرے بس کا نہیں، فرمایا: تشخیص ان سے ایک مرتبہ کرالیں، علاج میں کرلوں گا، ایسی صورتوں میں بے تامل کسی دوسرے حکیم وڈاکٹر کا مشورہ دینا یا قبول فرمالینا تو کوئی بات ہی نہ تھی۔

کچھ ذاتی تجربات

میری والدہ مرحومہ کو حضرت والد ماجدؒ کے طبیب ہونے اور گھر بھر کے مریضوں کا علاج دیکھتے دیکھتے اور اپنی غیر معمولی فہم و فراست کی بدولت ایسا تجربہ ہوگیا تھا کہ گھر میں بچوں وغیرہ کی معمولی بیماری آزاری میں باہر کا معالج کم ہی تلاش کرنا پڑتا، بارہا ایسا ہوا کہ ان کی بتائی ہوئی دوا کیا پورے نسخہ کو جس میں کئی کئی اجزاء تک ہوتے، بلا ترمیم فرمادیتے کہ ٹھیک ہے، بلکہ ایک آدھ بار تو خیال آتا ہے کہ خود اپنی تجویز اس کے مقابلہ میں واپس لے لی، ایک طرف اپنے خاص فن ڈاکٹری و یونانی کے ساتھ کسی بیجا عصبیت سے، آپ نے دیکھا دل و دماغ کتنا پاک تھا، دوسری طرف ذہن اتنا مجتہدانہ تھا کہ کسی دوسرے فنی معالجہ کی کوئی دوا تحقیق و تجربہ سے کامیاب پاتے تو اس کو مستقلاً اپنے مطب میں داخل فرمالیتے، لال مرہم ایسا ہی تھا، جو کسی عطائی حافظ مبین صاحب سے ہاتھ آیا تھا(۱)، بعض مرتبہ آیورویدک دوا خود میرے لیے تجویز فرمائی، باقی ہومیوپیتھک علاج تو مستقلاً کرنے لگے تھے، یہ عجیب طریق علاج بھی قدرت کی عجیب شان ہی شان ہے، کہ جتنی دوا کی مقدار کم سے کم ہوتی چلی جاتی، تاثیر اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے، خود مجھ کو بعض شدید بیماریوں میں جو ڈاکٹری و یونانی کے بس سے باہر ہوچکی تھیں، اس کے بالکل ایسے کراماتی تجربات ہوئے کہ آپ بیتی نہ ہوتی تو یقین کرنا مشکل ہوتا۔

دمہ کے لیے میرے خون کا ٹسٹ کرا کے خود ڈاکٹر صاحب ہی نے انجکشنوں کا ایک سلسلہ شروع کردیا جو بہت کارگر مانے جاتے ہیں، خود میری لڑکی اور لڑکے کو نفع

---

(۱) یہ مفید مرہم ''اندمول'' (INDAMOOL) کے نام سے حسنی فارمیسی گوئن روڈ لکھنؤ سے تیار ہوکر نکل رہا ہے، اور بڑا ہی کارگر ہے اور اس دواساز ادارے کے نزدیک تیر بہدف دواؤں میں سے ایک ہے، پھوڑوں اور خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم بہت مفید ہے۔

ہو چکا تھا، مگر مجھ کو دو ہی تین انجکشنوں کے بعد تیز بخار اور بدن میں دانے نکل آنے کے ساتھ رعشہ ایسا شدید ہوا کہ نہ اپنے ہاتھ سے کھا سکتا، نہ پی سکتا، پلنگ اور دیوار کے درمیان چوکی لگادی گئی تھی، دیوار پکڑ کر بڑی مشکل سے رفع حاجت کر پاتا، ڈاکٹر صاحب ہی کے مشورہ سے ایک اور ہونہار ڈاکٹر بھی شریک علاج تھے، دونوں کی رائے ہوئی کہ یہ ان انجکشنوں کا ردعمل ہے، پھر دونوں کے مشورہ سے اس کے توڑ یا رد کے انجکشن کئی ہفتے چلے، کوئی نفع محسوس نہ ہوا، اب دوسرے ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ کوئی اور علاج تو ہمارے یہاں اس کا ہے ہی نہیں، انھیں انجکشنوں کو پھر دوہرایا جائے، ہمارے ڈاکٹر صاحب خاموش رہے، اور ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ کچھ بھی نفع ان سے معلوم ہوتا تو مزید نفع کی توقع کی جاتی، اب ہومیو پیتھک علاج کراؤ، سمجھا کہ خود ہی کریں گے، مگر نہیں، ایک دوسرے ڈاکٹر کا پتہ دیا اور فرمایا کہ ان کے دادا کلکتہ سے آئے تھے، تین پشتوں سے ان کے یہاں اس کے تجربات کا سلسلہ جاری ہے، ان کو اسی وقت بلایا گیا، حال سنا، دوا دی، ابھی ایک ہی خوراک استعمال کی تھی کہ چند گھنٹوں میں ہی کچھ فرق محسوس ہونے لگا، خیال ہوا، وہم ہے، آخر دوا کوئی جادو تو ہے نہیں، مگر ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اتنا نمایاں فرق محسوس ہو گیا کہ وہم کو جادو ہی ماننا پڑا، اور ہفتہ عشرہ میں بحمد اللہ بحال ہو گیا، پھر کیا تھا گھر بھر کو مسیحا ہاتھ آ گیا، جس کو جو شکایت تھی، سب ہی ان کے پاس دوڑ پڑے، کسی کو کچھ نفع نہ ہوا، جادو بھی "لا شافی إلا هو" کی مشیت کے بغیر جادو کا کام کیسے کر سکتا۔

ایک اور ایسا ہی کراماتی تجربہ بہرے پن کی شکایت میں ہوا، پہلے خود ڈاکٹر صاحب ہومیو پیتھک علاج ہی فرماتے رہے، جب نفع کی صورت نظر نہ آئی، تو میڈیکل کالج کے ناک، کان، حلق کے خصوصی ماہر کو دکھلانے کا مشورہ دیا، وہاں کمی کے بجائے زیادتی ہونے لگی، تو پھر کئی ہفتے ایک ایسے ہی ولایت مآب ماہر خصوصی نجی

ڈاکٹر سے رجوع کرایا، فیسوں اور دواؤں کی نوبت، سیکڑوں تک گئی ہوگی، مگر

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حتی کہ اب سلیٹ پنسل رکھی رہتی اور کانوں کا کام بھی صرف آنکھوں سے لینا پڑتا، اور تھک کر آخر ہمارے ڈاکٹر صاحب نے پھر ہومیو پیتھک کا مشورہ دیا، البتہ بجائے کسی پیشہ ور کے بجائے مرحوم چودھری نعیم اللہ صاحب ایڈوکیٹ کو فرمایا، کہ وہ باقاعدہ مطب تو نہیں کرتے لیکن ان کی نظر کتابوں پر بہت ہے، اور ضرورت اسی کی ہے کہ تمہارا حال ہی نہیں بظاہر موجودہ مرض سے غیر متعلق حالات وامراض کو تفصیل سے سن کر اور کتابیں دیکھ کر دوا معلوم کی جائے، جس کی توقع کسی پیشہ ور سے نہیں۔

دیکھا آپ نے مومنانہ ومعالجانہ ذمہ داریوں کی نگاہ ڈاکٹر صاحب کی کہاں کہاں تک جاتی تھی، چودھری صاحب موصوف یوں بھی دوسروں کے کام آنے والے بڑے بااخلاص اور پرجوش مذہبی آدمی تھے، پھر میرے مکتب کے ساتھی اور پچاس سال سے بے تکلف دوست تھے، میرے حالات پوچھ پوچھ کر اور کتابیں دیکھ دیکھ کر کوئی ڈیڑھ دو گھنٹہ میں دوا معلوم کی اور اپنے پاس ہی سے ایک ہزار طاقت کی ایک خوراک کھلا دی، کام جادو ہی کا ہوا، نمایاں فرق غالباً دوسرے ہی دن ہوگیا، اور دوسری خوراک کی ضرورت پڑے بغیر بحمد اللہ بقدر ضرورت اتنی سماعت تو ازسرنو واپس مل گئی کہ زندگی کے کام کاج چل رہے ہیں۔

ظاہری اسباب محض ظاہری یا انتظامی حیثیت رکھتے ہی ہیں، ہومیو پیتھک کے اس طرح کے اپنے پڑتے تجربات سے ایک بات اور سمجھ میں آئی کہ قدرت کے تقاضوں اور خدا کی رحمت دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ جس طرح بیماریاں عام ہیں، آئے دن امیر وغریب سب ہی کو ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح ان کا علاج بھی آسان وارزاں ہونا چاہیئے، نہ کہ ایک مرض کے لیے خصوصی ماہروں، طرح طرح کے امتحانی آلوں،

قیمتی قیمتی دواؤں، بات بات میں انجکشن کی بھرمار، ان کی بیماریوں سے بڑھ کر اس خرچیلے دوا علاج کی بیماری کے عہد میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت کے کرشموں کا یہ ہومیو پیتھک طریق علاج خوب نکال دیا، کہ جب وہ نفع اور شفا دینا چاہتے ہیں تو بے قیمت کی دوا کیا محض دوا کے نام سے ایسی شفا دے دیتے ہیں کہ قیمتی سے قیمتی دوائیں آپ نے اوپر ہی دیکھ لیا کہ منھ دیکھتی رہ جاتی ہیں، بے قیمت ایسی کہ آج کہ ہمہ گیر گرانی کے دور میں بھی ایک ڈرام دوا صرف تین پیسے میں آتی ہے(۱) اور ہفتوں چلتی ہے، اصل میں مسبب الاسباب کے غیب میں ہونے کی وجہ سے اس شہادتی عالم اسباب میں جس طرح ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی اسبابی و انتظامی حیلہ واسطہ ضروری ہے، اسی طرح بیماریوں میں بھی کوئی نہ کوئی دوائی بہانہ نفس کی تسلی کے لیے ضروری ہے تو وہ اس کی مادی دوا اور قیمت ہومیو پیتھک کی سی برائے نام کیا نہ ہونے ہی کے برابر ہو۔

دوا علاج کے معاملہ و سلسلہ میں اس راقم کے اس طرح کے خیالات اکثر موضوع گفتگو رہتے، ڈاکٹر صاحب بہت محظوظ ہوتے، درمیان درمیان میں اپنے تجربات کی توثیقی مہر ثبت فرماتے جاتے، اور میں نے تو کہنا چاہیے کہ ان سے باقاعدہ عہد لے رکھا تھا کہ میرے دور میں میرے گھر والوں کے علاج میں سب سے پہلے ہومیو پیتھی دواؤں سے کام لیا کریں، اکثر نفع بھی ان ہی سے اللہ تعالیٰ فرما دیتے ہیں، ڈاکٹری، یونانی کی نوبت کم آتی، چودھری نعیم اللہ صاحب اور وہ، دونوں فرماتے کہ تم کو خصوصیت سے نفع اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ پان، سگریٹ، تمباکو وغیرہ کی سی ان دواؤں کے منافی مضر چیزیں بالکل منھ کو نہیں لگاتے۔

بیماریوں کی کثرت اور ڈاکٹر صاحبؒ کا تأثر:

چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں طرح طرح کی بیماریوں کی کثرت کی

---

(۱) یہ ۶۲-۱۹۶۱ء کی بات ہے، آجکل کی اس ہوش ربا گرانی میں اس کی قیمت دس روپے ہے۔

بڑی وجہ یہی فرماتے کہ طرح طرح کی ایسی مضر چیزیں روزمرہ کی زندگی میں شریک ہوگئی ہیں جو ایک طرف بیماریوں کو بڑھاتی ہیں اور دوسری طرف طبعی مدافعت اور دواؤں کی تاثیری قوت کو گھٹاتی ہیں، ایک بیماری آزاری اور دوا علاج کے معاملہ میں کیا ماڈرن یا فرنگی وسائنسی پوری زندگی کا سب سے بڑا روگ یہی ہے کہ ایک طرف زندگی کے ہر شعبہ میں مفاسد و مہلکات کے اسباب و دواعی کو گھٹانے کی جگہ روز افزوں ترقی پر ترقی کو عین ترقی قرار دے لیا گیا ہے، دوسری طرف ان کی روک تھام کے لیے قانون سازی کے طوماروں پر طوماروں اور خرچیلی سے خرچیلی تدبیروں پر تدبیروں کا سلسلہ چلا جاتا ہے، اس کی بدولت پوری زندگی نہ ختم ہونے والی برائیوں پر برائیوں کا ایسا چکر بن کر رہ گئی ہے کہ جو ایک دوسرے سے پیدا ہوتی ہے اور برابر بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔

ابھی تازہ صدق (۱) (۱۱ر اگست ۱۹۶۱ء) نے ایک لندنی روزنامہ سے ایک مضمون کا خلاصہ نقل کیا ہے جس کی موٹی موٹی سرخیاں خود اسی روزنامہ نے یہ دی ہیں: قوم کو ہلا دینے والی جان کا ٹیکس، ''حادثوں سے ۵۴ ہلاکتیں روزانہ''، ماہرین چیختے رہے، آگے تفصیل یہ ہے کہ:

> ''۳۳ ر ماہرین فن ڈاکٹروں اور سرخیلوں نے مل کر وزیر صحت کی خدمت میں درخواست پیش کی ہے کہ مزید ڈاکٹروں اور ایمبولینس کاروں کا فوری انتظام کیا جائے، اس وقت بھی چار کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کی رقم ان زخمیوں کے علاج معالجہ پر خرچ

---

(۱) ''صدق'' لکھنؤ سے مشہور صاحب طرز انشاء پرداز، ادیب اور مصنف مولانا عبدالماجد دریا آبادی علیہ الرحمہ کی ادارت میں پہلے ''سچ'' اور بعد میں ''صدق'' پھر ''صدق جدید'' کے نام سے ہفتہ میں ایک بار اپنی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا، اور بڑی شہرت کا حامل رہا، علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں اسے کافی مقبولیت اور اہمیت حاصل رہی، مولانا دریا آبادیؒ کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم نے اس کی ادارت سنبھالی، بعد میں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور بند ہوگیا۔

ہو رہی ہے، اور لوگوں کو صرف ایمبولنس کی مد میں بیس لاکھ پونڈ ادا
کرنا پڑتا ہے، اور حادثوں کی روز افزوں کثرت کا باعث ایک تو
تیز رفتار سواریوں کی کثرت اور پھر اس تیز رفتاری پر مزید روز
افزوں ترقیاں ہیں۔''

پیدا کرنے والے نے انسان کا جو مقام و مقصد رکھا ہے، اس کی عظمت و اہمیت کو وہ خود بھلا نہ بیٹھا ہوتا، "نسوا اللّٰه فأنساهم أنفسهم"(۱) تو ان بڑی سے بڑی نام نہاد ''روز افزوں ترقیوں'' کی قیمت میں ایک نیم جان انسان دنیا میں گردن ہی گردن پاتا۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب بظاہر بڑی خاموشی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر فرماتے، مگر اخبار پابندی سے پڑھتے، ایسی چیزوں پر نظر بھی خوب پڑتی، اور ان ترقیوں اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو خدا فراموشی کا خمیازہ اور خدائی قہر تصور فرماتے، مکان کے قریب لاؤڈ اسپیکر کی کوئی دوکان کھل گئی تھی، بڑی اذیت کے ساتھ فرمایا: دعا کرو اس سے نجات ہو، نیند حرام ہو جاتی ہے، لوگ کیسے بے حس ہو گئے کہ ترقی کے ان عذابوں کو محسوس ہی نہیں کرتے۔

مجتہدانہ شان

ہومیو پیتھ علاج کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا نظریہ ہم نے ابھی ذکر کیا تھا گو تجربات نے اس طریق علاج کا ڈاکٹر صاحب کو قائل بہت کر دیا تھا اور کام بھی وہ اس سے بہت لینے لگے تھے، تاہم انصاف پسندی کی شان یہ تھی کہ بعض بیماریوں میں میرے اصرار کے بعد بھی ہومیو پیتھک دوا نہ دیتے اور فرما دیتے کہ کوئی کارگر دوا اس کے لیے تجربہ میں نہیں آئی، اس طرح مجتہدانہ شان یہ تھی کہ ایک ہی مرض میں بارہا

---

(۱) سورہ حشر آیت/۱۹۔

ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک دونوں دوائیں ساتھ ساتھ چلاتے، حالانکہ عام ہومیو پیتھ اس کو غلط جانتے ہیں، علیٰ ہٰذا اس طرح کی احتیاطوں پر بھی زور نہیں دیتے کہ ہومیوپیتھی کی دواؤں کو خصوصاً تیز خوشبو وبدبو وغیرہ چیزوں سے الگ رکھا جائے، اور کھاتے وقت منہ کو خوب صاف کرلیا جائے، اپنے ہم نام کمپاؤنڈر کے متعلق فرماتے کہ وہ تو ایک طرف منہ میں پان دبائے رہتے ہیں اور دوسری طرف سے دوا کھالیتے ہیں، پھر بھی فائدہ ہوتا ہے۔

غیر معمولی قابلیت اور دستِ شفا

بعض بڑے خوش فہموں کو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کے حاذق طبیب ومعالج ہونے کو شک کی نظر سے دیکھتے، بڑی وجہ ظاہر ہے، اونچی دوکانوں کا مغالطہ تھا، پھر موصوف کی غیر معمولی کم گوئی، سنجیدگی کہ مریضوں سے بھی جچی تلی بقدر ضرورت ہی گفتگو فرماتے، ورنہ میڈیکل کالج میں ان کے ساتھ پڑھے ہوئے ڈاکٹر فضل کریم جو حیدرآباد میں میرے معالج بھی رہے، کہتے تھے کہ ممدوح کی فن سے غیر معمولی مناسبت وقابلیت کی بنا پر ان کے استادوں اور ہم سب ساتھیوں کا خیال تھا کہ وقت کے بڑے نامی ڈاکٹر ہوں گے، اس کے باوجود یہ سمجھنا البتہ ہر شخص کے لیے آسان نہیں کہ ان کی گمنامی ''خود چاہی یا خدا چاہی'' تھی، ''تو چناں خواہی خدا خواہد چناں'' یہ راز اس نیاز مند رازدار کے لیے تو کبھی راز نہیں رہا، لیکن اب تو ان کے اس خط نے جو انھوں نے غالباً میڈیکل کالج میں داخل ہونے سے قبل لکھا تھا، طشت از بام ہی کردیا،(۱) کیا ''سعادت'' نہیں تھی کہ نوجوانی یا اسکولی زندگی ہی سے معاشی مستقبل کے متعلق اس طرز پر سوچ رہے تھے کہ ''مقصد زندگی حیات اخروی ہے اور دنیا مزرعۂ آخرت'' یعنی مقصود معاد ہے، معاش نہیں، اس لیے یہ (طلب معاش) اس حد تک

(۱) حصہ مخطوط میں یہ خط ملاحظہ ہو۔

ضروری ہے، جس حد تک وفا جوئی کے لیے کارآمد ہو، اور صاف صاف کہتے کہ ''اس کے بعد وفائی جوئی مخل نہ ہو تو مباح ہوگی اور اگر اوقاتِ عزیز کو ضائع کرے تو حرام ہوگی''، آگے اس طویل خط میں ''خود چاہی یا خدا چاہی'' گمنامی کا راز مخفی ملاحظہ ہو کہ ڈاکٹر سے ہچکچاہٹ کی بڑی وجہ تھی کہ ''مطب میں کامیابی کی صورت میں اگر ایمانداری سے کام کروں تو نہ وقت بچے گا نہ دماغ۔''(۱)

لیکن ربِ اعلیٰ وعظیم کی ربوبیتِ قدرت ونسبت نے دونوں کو کیسا جمع فرمادیا، کہ نہ مطب میں اتنی کامیابی کی صورت پیدا ہونے دی کہ اس دوکانداری کے دور میں ''ایمانداری سے کام کرنے میں'' رائی برابر فرق آتا، اور نہ وقت ودماغ اتنا لگانا پڑا کہ ''مقصد زندگی اور وفائی جوئی کے مشاغل میں خلل پڑتا۔''

حذاقت یا دستِ شفا کا معاملہ تو سنا سنایا نہیں، براہ راست اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں، تیس بتیس سال کی طویل مدت میں گھر بھر اور دور ونزدیک کے بیسیوں عزیز ودوست ایسے مریضوں میں جو مرحوم کے مستقل زیر علاج رہے، میرے بہت سوچنے پر بھی بس ایک دس بارہ سال کے بھتیجے اور اسی نوے سال کے لگ بھگ عمر طبعی کو

---

(۱) ڈاکٹر صاحب کا یہ طویل اور اہم اور فکر انگیز خط ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۶۱ء میں سات صفحوں میں شائع ہوا، خط کا لفظ لفظ پڑھنے کے لائق ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (م ۱۹۲۳ء) کو اس خط میں "سیدی ولی نعمی متعنا اللہ بحیاتہ" سے مخاطب کیا ہے، اس خط کو بعد میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ نے اپنی کتاب ''حیات عبدالحی'' میں شامل کیا، ملاحظہ ہو، ص/۳۶۰-۳۶۶ (مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی)۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے برادر معظم ومربی ومحسن مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے مختلف مکتوبات جمع کیے جو والد مرحوم، والدۂ ثانیہ (آپ کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا، جب آپ کم سن تھے) ہمشیرہ صاحبہ اور خود حضرت مولانا ندوی کے نام ہیں، یہ خطوط ماہنامہ الفرقان کے شماروں بابت جون جولائی اور اگست ۱۹۶۱ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ، محرم ۱۳۸۱ھ وصفر ۱۳۸۱ھ میں تین قسطوں میں شائع ہوئے، جس کے لئے ادارہ الفرقان شکریہ کا مستحق ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی ڈاکٹر صاحب کے ان خطوط کو خصوصاً جو ڈاکٹر صاحب نے آپ کو لکھے ہیں، شفیق والدین، جاں نثار بھائیوں اور مربیوں واتالیقوں کے لیے دستور العمل اور چراغ راہ کی حیثیت دیتے ہیں۔ (یہ مجموعہ خطوط کتاب کے آخر میں ملاحظہ ہو۔ مرتب)

پہنچے ہوئے ماموں اور والد رحمہما اللہ کا یاد آتا ہے، خود گوناگوں امراض کی چوٹ راقم سطور جو لکھنؤ میں مستقل قیام کے بعد ادھر پندرہ سولہ سال سے بالکلیہ ڈاکٹر صاحب ہی کا زیر علاج اور جو اُن سے معمر ہی نہیں بظاہر ظاہراً و باطناً ہر طرح کمزور ہی کمزور اور بیمار ہی بیمار تھا، ان کے بعد تک ان کی زندگی کے کچھ سبق سنانے کے لیے گرتا پڑتا زندہ چلا جارہا ہے، اور دمہ کا مرض جو دم کا ساتھی خیال کیا جاتا ہے، ایسا غائب ہوا کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں، گھر بھر کے مریضوں کی یہ شہادت ہے، کہ بارہا ایک ہی خوراک سے نفع ہو جاتا، اس سے بڑھ کر شہادت صادقہ ''صاحب صدق'' مولانا دریابادی مدظلہ (۱) کی سنئے کہ:

''اپنا ذاتی تجربہ ایک آدھ بار کا نہیں بارہا کا ہے کہ بڑی سے بڑی

---

(۱) مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ بارہ بنکی کے قصبہ دریا آباد کے رہنے والے تھے، ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مولوی عبدالقادر صاحب مولانا محمد نعیم فرنگی محلی صاحبؒ کے شاگرد خاص تھے، اور بڑے سادہ مزاج اور خوش اوقات تھے، آپ کی والدہ صاحبہ بی بی نصیر النساء بھی اوصاف حمیدہ سے متصف تھیں۔

مولانا دریابادیؒ پر کئی دور گذرے، ایک انتہائی سنگین الحاد کا، لیکن صحبت اخیار کی رہی، اور ظلمت کدہ سے بڑی صفائی سے نکل آئے، اصلاً عصری تعلیم حاصل کی، لیکن علامہ شبلی نعمانیؒ (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) سے اکتساب فیض کیا، اور طریقت میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اپنا مربی و رہبر بنایا، اور بیعت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے کی، حضرت تھانویؒ کی تربیت کا آپ پر بڑا گہرا اثر تھا، اور ان ہی کے ہو کر رہ گئے تھے، تفسیر قرآن کریم مع ترجمہ کے لکھی، اللہ تعالیٰ نے اسے قبولیت و شہرت بھی عطا فرمائی، اس میں بھی حضرت تھانویؒ سے خاصا استفادہ کیا، مولانا محمد علی جوہر سے کافی متاثر و قریب تھے، دوستانہ مراسم علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی سے رہے۔

قلم بہت زور کا تھا، اردو کے بڑے انشاء پرداز تھے، انگریزی پر بڑی اچھی قدرت تھی، علوم جدیدہ اور فلسفہ پر گہری نظر تھی، اسلامیات پر اچھا مطالعہ تھا، بہت سی کتابیں لکھیں، تفسیر ماجدی (انگریزی و اردو) ذکر رسولؐ، حکیم الامت نقوش و تأثرات، محمد علی ذاتی ڈائری اور انشائے ماجدی زیادہ مشہور ہیں۔

مولانا دریابادی مرحوم صدق اخبار کے بانی اور آخر وقت تک ایڈیٹر رہے، اس میں آپ کے شذرات خاص طور سے زیادہ مشہور ہوئے، مشہور اردو ادیب و نقاد اور نامور نعت گو شاعر مولانا ماہر القادری مرحوم لکھتے ہیں:

''سچ اور صدق جدید میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے شذرے دراصل زبان و ادب کے شہ پارے ہیں۔''
(یادرفتگاں، ج/۲، ص/۸۲-۸۳)

مولانا مرحوم نے ایک طویل علالت کے بعد ۶/ جنوری ۱۹۷۷ء کو لکھنؤ میں رحلت فرمائی، دریاباد میں مدفون ہوئے، وصیت کے مطابق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ نے مجمع کثیر کو نماز جنازہ پڑھائی۔

تکلیف کے وقت ادھر ڈاکٹر صاحب کو دکھایا، ادھر بیماری رخصت، کبھی کبھی دوا کی ایک خوراک سے۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب کے ڈاکٹر ہونے کی خصوصیات کا ذکر اتنا مدنظر بالکل نہ تھا، بے ساختہ قلم چلتا گیا، مگر آپ نے دیکھا کہ ان کی یہ زندگی بھی پیشہ کی عام شاہراہ سے کتنی الگ اور ممتاز تھی، بات ایک ہی ہے، ان کے نزدیک یہ زندگی "علم را برتن زنی مارے بود" آج کل کی خالص دنیوی تعلیم سے تو کیا پیدا ہوتی کہ وہ تو نام ہی تمام تر تن پروری اور لازماً دل کی موت کا ہے، نام کی دینی تعلیم بھی اب درس و تدریس یا زبان و قلم سے تجاوز کر کے دلوں تک کتنوں کے پائی جاتی ہے۔

---

(۱) (صدق ۱۹ر مئی ۱۹۶۱ء) مرحوم پر مولانا دریابادی کے یہ جو تأثرات "صدق" میں قلم بند فرمائے ہیں، اب وہ "وفیات ماجدی" کے نام سے لکھنؤ اور کراچی سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔

اوصاف وکمالات اور امتیازات وخصوصیات

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ کی صحیح تصویر

ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری اور غیر ڈاکٹری کی اندرونی وبیرونی پوری زندگی دراصل ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ﴾ (۱) والے سرتاپا خشیتِ علم یا ''علم را بردل زنی یارے بود'' کی آئینہ دار تھی۔ (۲)

---

(۱) سورۂ فاطر آیت/ ۲۸۔

(۲) علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ ''یادِ رفتگاں'' میں آپ کے متعلق آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی (م ۱۹۲۳ء) کے تذکرہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھنؤ میں ڈاکٹری کے پیشہ کے ساتھ صلاح وتقویٰ، زہد وورع کے ساتھ معروف ہیں اور خاموشی کے ساتھ تبلیغ دین میں مصروف رہتے ہیں۔'' (ص/ ۷۴، مطبوعہ کراچی)

مولانا رئیس احمد جعفری ندوی جو ندوہ کے فضلاء اردو کے مشہور ادباء ومصنفین میں ہیں، ڈاکٹر صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''وقت کا بڑا حصہ یا مطب میں صرف ہوتا ہے یا مسجد میں، مصروفیت کا یہ عالم کہ نہ صرف کامیاب معالج ہیں، ندوہ کے موروثی ناظم بھی ہیں، اس کے انتظام وانصرام میں بھی اپنا وقت صرف کرتے ہیں، نوافل کے بھی اتنے ہی پابند ہیں جتنے فرائض کے، بہت کم گو اور کم سخن ہیں، شرافت نفس کی یہ کیفیت کہ بعض مریض رات کو سوتے سے اٹھا کر گھر لے جاتے ہیں اور بجائے ڈبل فیس دینے کے تانگہ کا کرایہ بھی ان ہی سے دلواتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں...... اس خاندان میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بزرگ پیدا ہوتا رہا ہے، یہ اگر سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ''الولد سرّ لأبیہ'' کے صحیح مصداق ہیں۔'' (دید وشنید، ص/ ۱۸-۳۱۷، مطبوعہ کراچی)

مصنف تاریخ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''ان کی زندگی سادہ اور اپنے اسلاف کا نمونہ تھی۔'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج/۲، ص/۱۱۳)

ان کے احتیاط وتقویٰ اور خشیت کا یہ حال تھا کہ ندوۃ العلماء جس کے وہ ناظم تھے اس کے کام کے لیے جس قلم کا استعمال کرتے اسے اپنی ذات سے متعلق کام میں استعمال میں لانے سے گریز کرتے اور اتنا ہی نہیں بلکہ جب وہ قلم لکھنے کے لائق نہ رہ جاتا یا قلم چھیلنے پر اس کا چھلکا باہر آتا اسے بھی ضائع نہ ہونے دیتے اور جب وہ کئی قلموں کا اکٹھا ہو جاتا تو اسے وہ اس کام میں لاتے جس کے وہ لائق ہوتا یا فروخت کرکے اس کی قیمت سے دوسرا قلم اسی مقصد کے لیے حاصل کر لیتے یا پھر قیمت ادارے میں جمع کر دیتے۔ (روایت مولانا سید طاہر منصور پوری مرحوم سابق مددگار ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ داماد حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ زندگی یہی ہے کہ دل میں خدا اتنا رچ بس جائے کہ قالب کی ہر جنبش کا محور خدا ہی سے خوف و رجاء یا اس کی رضا و ناراضی بن جائے، اس کے بغیر لاکھ سر مارا جائے، انسان کی دنیوی زندگی بھی نہ انفرادی استوار ہوسکتی ہے نہ اجتماعی، دنیا کے جاہی و مالی محرکات و مطالبات اور نفسانی خواہشات و جذبات کو خدا طلبی و آخرت پسندی کے سوا کوئی دوسری چیز ہرگز اندھیرے اجالے ہر موقع پر قابو میں نہیں رکھ سکتی۔

احساس ذمہ داری، معاملہ فہمی اور دینی و دنیوی بصیرت

ڈاکٹر صاحبؒ کوئی تارک الدنیا قسم کے دیندار بالکل نہ تھے، جن چیزوں کو خالص دنیاداری خیال کیا جاتا ہے، ان میں بھی ایسی مشغولی تھی کہ وطن (رائے بریلی) نانیہالؔ (ہنسوہ) اور لکھنؤ میں اچھے بڑے باغات لگائے، لکھنؤ میں پختہ چالیس بیگھے سے زیادہ کا باغ خود ہی اس نیازمند کو شریک فرما کر لگایا(۱) اور مجھ کو ہزار میل دور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اسی خشیت کا ایک دوسرا واقعہ راقم السطور نے اپنے دادا اور ان کے سب سے بڑے داماد مخدومی جناب سید محمد مسلم حسنی زید مجدہم سے سنا کہ وہ اپنے محلہ کی مسجد میں امامت بھی فرماتے تھے، اور احتیاط اس قدر اس نازک ذمہ داری میں برتتے کہ ہومیو پیتھ کی دوا بھی جیب میں نہ رکھتے کہ اس میں "الکحل" ملا ہوتا ہے، ایک بار وہ جیب سے نکالنا بھول گئے اور نماز پڑھادی پھر ان کو خیال آیا اور احتیاط کے تقاضہ سے نماز دہرائی۔

آپ کے برادر اصغر اور عالم اسلام کی نامور شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ (ڈاکٹر صاحبؒ) اپنی بہت سی خصوصیات وکمالات کی وجہ سے ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے، جس میں قدیم وجدید تہذیب وثقافت اور مشرقی ومغربی علوم کا نہایت حسین ودلآویز امتزاج نظر آتا ہے، جو ﴿مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان﴾ کی ایک عملی تفسیر تھے، ان کی زندگی میں مسلمان نوجوانوں، مدارس دینیہ کے فضلاء اور عصری جامعات و یونیورسٹیوں کے فارغین اور ملی اداروں کے سربراہوں کے لیے بہت سے سبق اور قابل تقلید نمونے ہیں۔" (حیات عبدالحی ضمیمہ ڈاکٹر سید عبدالعلی، ص/۴۴۵، مطبوعہ پونا مہاراشٹر، وکراچی پاکستان)

(۱) ڈاکٹر صاحبؒ نے رائے بریلی اور ہنسوہ میں بغیر اشتراک کے باغ لگائے، رائے بریلی، لکھنؤ سے ۷۰، ۸۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، اور ہنسوہ ضلع فتحپور کا ایک مردم خیز قصبہ ہے، جو رائے بریلی سے تقریباً اتنی ہی مسافت پر واقع ہے، باغات کے سلسلہ میں ان کے اہم مشیر ان ہی کے ایک عزیز ڈاکٹر معین الدہر ہنسوی مرحوم تھے جو ان کے مخلص اور اس سلسلہ میں ماہر تھے۔

حیدرآباد میں رہ کر خالی شرکت ہی شرکت کی سعادت حاصل رہی، ورنہ وہی اس کے ابتدائی محرک ومجوز سب کچھ تھے، اوران ہی کی نگرانی میں انتہا تک پہنچی، جب میں پنشن پر آیا تو قریب قریب تیار پایا، فہم سلیم جس کو انگریزی میں ''فہم عام'' (Common Sence) کہتے ہیں، ماشاءاللہ ایسی سلیم اور عام وہمہ گیر تھی کہ تھوڑی واقفیت اور تجربہ سے ہر معاملہ میں بقدر ضرورت خاصی بصیرت پیدا ہوجاتی، باغبانی کے متعلق مختلف کھادوں نیز درختوں، پھلوں کی بیماریوں وغیرہ سے متعلق اچھی خاصی واقفیت وبصیرت بہم پہنچالی تھی۔

لیکن ان کی یہ دنیاداری جیسی عین دینداری تھی، اس کا اندازہ ''مشتے نمونہ ازخروارے'' ایک ہی واقعہ سے کرلیجئے، باغ کے ایک بیل میں عیب یہ ہوگیا کہ جوتائی وغیرہ میں چلتے چلتے بیٹھ جاتا، جب کسی طرح یہ عیب دور نہ ہوا، تو مویشیوں کے کسی بازار میں بکوانے (فروخت) کے لیے بھجوادیا، تھانوی جوتیوں کی بدولت بعد کو مجھ کو خیال آیا کہ یہ ہدایت کرنا رہ گیا ہے کہ خریداروں پر بیل کا یہ عیب ظاہر کردیا جائے، مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ یہ تو بڑی چوک ہوگئی، فرمایا: نہیں، میں نے ہدایت اس کی تاکید کردی ہے، اب سننے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بیل بکا اتنے ہی کا جتنے کا وہ خریدا گیا تھا، اور خریدار نے کہا کہ ٹھیک ہوجائے گا۔

ندوہ کی نظامی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں وقف کا ایک مقدمہ تیس بتیس (۳۰-۳۲) سال لڑنا پڑا، کبھی اس پر گفتگو فرماتے تو میں ششدر رہ جاتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تو خود کچہری کے معمولی مختاروں، کارپردازوں سے زیادہ مقدمات کو سمجھ لینے لگے ہیں، خصوصاً جب خود اپنی اسی باب میں انتہائی نافہمی ونااہلی سے مقابلہ کرتا کہ ایک نجی وقف ہی کی بدولت بعض مقدمات میں پھنس کر آج تک نہ کوئی بات مختار کی

ٹھیک سمجھ پاتا ہوں نہ وکیل کی، بس یہ سمجھتا ہوں کہ دل ودماغ لے کے اس دنیا میں شاید ہی کوئی ''عذاب الیم ومھین'' موجودہ دور کے عدالتی چکروں سے بڑھ کر ہو، نام کی ان عدالتوں میں حق اور سچائی کے مقابلہ میں ظالموں اور چوروں ہی کے لیے ہر طرف چور دروازے زیادہ سے زیادہ کھلے رکھے گئے ہیں، پھر دیکھا کہ لوگ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں، عادت کی قہرمانی کے سوا کیا کہا جائے کہ جہنم بھی جہنم نہیں معلوم ہوتی، ڈاکٹر صاحب کو بھی اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً بڑی اذیتوں کا سامنا رہتا، بعض وقت مضطر ہوکر دعاء کے لیے ارشاد فرماتے، تاہم ان کی نظر چونکہ بالکلیہ ایک دینی ادارہ کے وقف کی حفاظت وخدمت اور خدا وآخرت کی وفا واجر پر رہتی، اس لیے یہ تلخیاں ''از محبت تلخہا شیریں شود'' کا حکم رکھتیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ممدوح کی اس نظر دقیق ہی نے مقدمہ بازی کی ان طویل ومدید پریشانیوں کے بعد ندوہ کے اس وقف کو بہت کچھ بچالیا، آخر میں جن مشہور ایڈوکیٹ حکیم الدین صدیقی صاحب کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی، جو اس نیازمند کے پرانے عنایت فرما تھے، وہ خود مجھ سے ڈاکٹر صاحب کی معاملہ فہمی خصوصاً اس مستقل مزاجی کے بہت معترف تھے کہ معاملہ کو ایک مرتبہ اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد پھر ان کو کوئی ڈانواڈول نہیں کرسکتا تھا، مقدمات ہی کے معاملہ میں اپنا ایک تجربہ وفیصلہ خود راقم ہٰذا کو یاد ہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ سنایا کہ معمولی ووقتی مشورہ کے علاوہ کوئی مستقل کام کسی دینی مدرسہ وادارہ کا بھی کسی بظاہر دیندار وکیل سے بھی بلامحنتانہ ہرگز نہ لینا چاہیے، ورنہ محنتانہ تو بچتا ہے مگر کام اکثر بگڑ جاتا ہے، ان چیزوں کا شمار تو پھر بھی مہمات امور میں ہوسکتا ہے لیکن ان کی ادائے حقوق وفرائض میں وفا وآخرت والی ایمانی واحتسابی نظر گھر کی روزمرہ کی معمولی معمولی جزئیات تک پر رہتی، مدتوں اپنا معمول رہا کہ جمعہ ڈاکٹر صاحب کی مسجد میں ہی پڑھتا، اور عصر تک ان کی خاص آرامگاہ میں آرام اور باتیں کرتا رہتا، بارہا الماریوں پر پیاز

وغیرہ کی سی چیزیں پھیلی دیکھتا، فرماتے کہ ضرورت کی چیزوں کو وقت پر اور یکجائی طور سے فراہم کر لینے میں سہولت بھی رہتی ہے، اور برکت و کفایت بھی، حلال مال بھی بڑی نعمت ہے، اس کی بڑی قدر و حفاظت کرنی چاہیئے۔

یہ خاص تھانوی ذوق کی بات تھی، کیا کہوں چھوٹے چھوٹے معاملات تک میں ذمہ داریوں کے ان احساسات کے ساتھ انتظامی مادہ ایسا تھا کہ اگر کسی سلطنت کی انتظامی ذمہ داریاں حوالہ کر دی جاتیں تو عمرین (عمر بن خطاب و عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما) کی خلافت کا ایک نظارہ اس ''حسنی عہد'' میں دنیا کے سامنے پھر آجاتا۔''

ایک مثالی مسلمان اور بحیثیت یوسف ثانی

﴿إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾

بڑے مثالی (آئیڈیل) مسلمان تھے، یہ سگ دنیا اپنی ہی شامت اعمال سے کچھ معاملات میں الجھ گیا ہے، جس کی بدولت ہر طرح اور ہر طبقہ کے خصوصاً اپنے بھائیوں کے آئے دن تجربات ہوتے رہتے ہیں، لیکن بڑے بڑے تسبیح و مصلیٰ اور اوراد و وظائف والوں میں چھوٹے چھوٹے خصوصاً روپیہ پیسہ کے معاملات میں تقویٰ کیا فتوے کی پرواہ کرنے والی بھی ایک مثال نہیں ملتی، اگر ایک مثال ملی تو ان ہی میں جن کا تسبیح و مصلیٰ خود فریبی و خدا فریبی تک نہیں پہنچی، باقی دنیا داری بنا دینے والی مثال تو ایک بھی نہیں ملی، بظاہر عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اوراد و وظائف کی کثرت والے مسلمان قطعاً نہ تھے، حقیقی معنی میں مسلمان وہی ہے جو بظاہر خالص دنیا ہی دنیا کے معاملات کو اپنا ایمانی، واقعاتی نظر و نیت سے دین ہی دین بناتا رہے، یہ ان مجاہدانہ و نازک ''جام و سنداں'' کا کھیل ہے، جو ہر ہوسناک کا کام نہیں، پیدا کرنے والے نے نہ طرح طرح کی ترغیبات و تحریصات سے بھری ہوئی اس دنیا کو

عبث پیدا کیا ہے، ورنہ اس میں انسانوں کو بلا کسی عظیم امتحانی یا ابتلائی متاع کے فرشتوں تک سے بڑھا دینے والی انسان کی ساری انسانی عظمت و بزرگی کا راز ہی یہ ہے کہ قدم قدم پر پھسلانے والی ان دنیاوی تحریصات و ترغیبات کے مقابلہ میں ایسا فرشتہ بن کر دکھلاتے کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ نکل جائے کہ ﴿إن هذا إلا ملك كريم﴾(۱)۔

جس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کو پھسلانے اور پھسلانے والی اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کی خواتین مصر کی زبانیں یہ پکار اٹھنے پر مضطر ہو گئیں کہ یہ تو انسان کیا بس فرشتہ ہی فرشتہ ہیں۔

اگر ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی ایسے ہی ابتلاء و امتحان میں ڈال دیئے گئے ہوتے تو خدا چاہتا ان کی بھی ایسی ہی ملکوتی معصومیت کے اظہار و اعتراف پر مضطر ہو جاتیں۔

میں وفات پر لوگوں سے ان کے ذکر میں بار بار دہراتا رہا کہ مرحوم کے دوسرے صفات و کمالات کو چھوڑ دیئے، جنت کی تو ان شاء اللہ وہ ایک "بین الشفتین" (۱) اور "بین الفخذین" (۲) ہی کی ضمانت دے اور لے کر گئے ہیں، خصوصاً جس عہد میں ہم لوگوں کو برہنگی و بے حیائی کے چلتے پھرتے زندہ و مردہ تصویری نظاروں سے نظر بچا کر نکلنا دشوار ہے، ڈاکٹر صاحب کا بیسیوں مرتبہ سواری میں ساتھ ہوتا رہا، مگر بے ضرورت کبھی ایک مرتبہ بھی نظر ادھر ادھر اٹھتے نہیں دیکھی، باقی "بین الشفتین" کی ضمانتی حفاظت کی شہادت تو ان کے پاس ہر بیٹھنے والا دے گا، کہ بے ضرورت و زائد از ضرورت ان کی زبان ایک لفظ کے لیے بھی شاید ہی کھلتی کسی نے سنی ہو، بعض دفعہ

---

(۱) سورۂ یوسف آیت/۳۱۔
(۲) زبان۔
(۳) شرمگاہ۔

زبردستی کسی جلسہ کے صدر بنادیئے گئے تو صدارتی بکواس کے رسمی فریضہ کو بھی خاموشی ہی سے ٹال گئے۔

لایعنی کاموں اور باتوں سے حد درجہ احتراز

ایسی ہی باتوں نے ڈاکٹر صاحب کے "حسن اسلام" کو ایسے مقام تک پہنچا دیا تھا کہ تیس چالیس سال کے طویل و مدید متنوع دور پر بھی ان کی زندگی کی کوئی ایک جنبش بھی ایسی یاد نہیں آتی جس کو "ترک مالایعنی" کا ترک کہا جاسکے، مباحات تک اسی لحاظ سے لایعنی ہی ہوتے ہیں کہ جس چیز پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا یا آخرت کا کوئی اجر و ثمر مرتب نہ ہو وہ لایعنی نہیں تو اور کیا ہوگی، وہ ایک ہی مثال ہیں جس کی شاید ہی کوئی دوسری مثال ہے۔

اولاد کے عقد میں سنت نبوی ﷺ کا پاس ولحاظ:

صاحبزادیوں کے عقد سب کے سب خاندان میں اور قریب ترین عزیزوں ہی سے ہوئے (۱) اور لکھنؤ ہی میں دعوت واطلاع کیا معنی ذکر بھی بے ضرورت خاص طور پر

(۱) علاوہ ایک صاحبزادی سیدہ فاطمہ مرحومہ کے، ان کا عقد منصور پور مظفر نگر کے سادات بارہہ سے تعلق رکھنے والے ایک صالح فرد مولانا سید محمد طاہر حسینی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا، جو لکھنؤ میں مقیم رہے، اور ندوۃ العلماء کے مددگار ناظم ہوئے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں تحصیل علم کیا، اصلاحی تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے رکھا اور خلیفہ ومجاز قرار پائے، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی ان پر نظر شفقت اور توجہ خاص رہی، اور یہ عقد بھی ان دونوں بزرگوں کے ایماء وانشراح پر ہوا......، شوال ۱۴۲۳ھ میں رحلت فرمائی اور رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

بڑی صاحبزادی سید حمیرا صاحبہ مرحومہ (۱۹۲۰ء-۱۹۹۴ء) کا عقد تکیہ رائے بریلی کے اسی خانوادہ حسنی کے ایک صالح فرد جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب دام مجدہٗ سے ہوا، سیدہ حمیرا صاحبہ نے ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ کی آخری تاریخ کو لکھنؤ میں رحلت فرمائی، اور اپنے آبائی قبرستان رائے بریلی میں مدفون ہوئیں، اوصاف حمیدہ سے متصف تھیں، ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کی تعلیم وتربیت نے خصوصی اثر ڈالا تھا، اللہ تعالیٰ خصوصی رحم وکرم اور مغفرت کا معاملہ فرماکر درجات عالیہ سے نوازے، دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے اپنے پیچھے چھوڑے، سیدہ زہراء اہلیہ مرحومہ مولانا سید احمد علی حسنی ندوی (ڈائرکٹر دارعرفات ومدیر سہ ماہی "تعمیر افکار" رائے بریلی) بڑی صاحبزادی ہیں، جنھوں نے ۱۲؍رمضان ۱۴۲۸ھ کو انتقال کیا، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شاید ہی کبھی کسی خاص عزیز ودوست سے فرماتے ہوں، اس دیرینہ نیازمند کی نیازمندیاں اب عزیزوں سے بھی بڑھ کر ہوچکی تھیں، مگر خود ہی کسی طرح اتفاقاً خبر ہوجاتی

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) رحمہا اللہ تعالیٰ وغفرلہا مغفرۃ تامۃ، سیدہ طاہرہ اہلیہ صاحبہ سید محمد عاصم حسینی دوسری صاحبزادی ہیں، جناب سید حسن حسنی صاحب (راقم کے والد ماجد) بڑے بیٹے ہیں، دوسرے جناب سید حسین حسنی ندوی مرحوم نے دوشنبہ ۱۵؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ کو وفات پائی، غفر اللہ لہ ورحمہ رحمۃ واسعۃ، سب سے چھوٹے ڈاکٹر سید احمد الحسنی صاحب ندوی ہیں۔

دوسری صاحبزادی سیدہ فاطمہ نے ۱۱؍نومبر ۱۹۹۸ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور تکیہ رائے بریلی میں مدفون ہوئیں، غفر اللہ لہا مغفرۃ تامۃ ورحمہا رحمۃ واسعۃ۔ ان کے بڑے بیٹے جناب مولانا سید سلمان حسینی ندوی مشہور ومعروف عالم دین اور عظیم خطیب وداعی اور معلم ومصنف ہیں، دوسرے بیٹے مولانا سید اسحاق حسینی ندوی مرحوم نے مختصر علالت کے بعد ۱۱؍محرم ۱۴۲۲ھ کو انتقال کیا، بعض غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اور بڑے ہی ہردلعزیز، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ورفع درجاتہ۔ تیسرے بیٹے مولانا سید صہیب حسنی ندوی جامعہ سید احمد شہید کٹولی کے مہتمم اور استاد حدیث ہیں، اور ایک بہن سیدہ مریم بی اہلیہ ڈاکٹر سید احمد الحسنی صاحب ہیں۔

تیسری صاحبزادی سیدہ خدیجہ کا عقد نامور مصنف اور مبلغ وداعی مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم (۱۹۲۵ء-۱۹۸۲ء) سے ہوا، ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے حقیقی بھانجہ اور ان کے تربیت یافتہ تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں تکمیل درس کیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بڑا خصوصی تعلق رہا، اور اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے، کئی مدرسے اور ادارے آپ کی یادگار ہیں، ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ کے بانی مدیر تھے، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ اہم تصنیف ہے، رحمہ اللہ وغفرلہ وتقبل خدماتہ، ایک صاحبزادی (جو اس ناچیز کی والدہ ماجدہ ہیں) اور ایک فرزند مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی ہیں، ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ، ومدیر ماہنامہ "رضوان" بارک اللہ فی حیاتہ۔ سیدہ خدیجہ مرحومہ نے ۳؍اگست ۱۹۹۹ء کو تکیہ رائے بریلی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئیں، اور ان کی صاحبزادی راقم کی والدہ ماجدہ سیدہ امامہ حسنی نے ۱۴؍شعبان ۱۴۲۶ھ کو وفات پائی، آبائی قبرستان تکیہ رائے بریلی میں مدفون ہوئیں، غفر اللہ لہما مغفرۃ تامۃ ورحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ۔

چوتھی صاحبزادی سیدہ رقیہ حسنی مرحومہ کا عقد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ سے ہوا، یہ بھی ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے حقیقی بھانجہ ہیں، ندوۃ العلماء کے ناظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر اور دیگر اہم تنظیموں کے مشیر کار اور اہم رکن ہیں، اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے جانشین کی حیثیت سے عالم اسلام میں معروف ہیں، آپ کی تین صاحبزادیاں سیدہ میمونہ حسنی اہلیہ مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی، سیدہ آمنہ حسنی اہلیہ مولانا سید عبداللہ حسنی اور سیدہ ہاجرہ اہلیہ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ہیں، سیدہ رقیہ بی نے مختصر علالت کے بعد ۱۸؍رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو انتقال کیا، تکیہ رائے بریلی میں مدفون ہیں، غفر اللہ لہا ورحمہا رحمۃ واسعۃ۔

پانچویں صاحبزادی سیدہ سکینہ حسنی عربی کے مشہور اہل قلم اور اسلامی مفکر مولانا سید محمد واضح رشید ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عقد میں آئیں، ترجمہ قرآن مجید اور بعض دوسری دینی وعربی کتابیں اپنے ان ہی والد ماجد سے پڑھیں اور سبھی بہنوں نے ضروری دینی وعربی تعلیم اپنے اپنے وقت میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تو شرکت کی سعادت مل جاتی، صرف صاحبزادہ سید محمد میاں (۱) اسعدہ اللہ فی الدارین کے عقد کے موقع پر خود جانے کیا دل میں آیا کہ بہت جی سے فرمایا: جی چاہتا ہے کہ تم

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ سے پڑھیں، اور اس تعلیم کو دوسروں کے لیے مفید بنانے کے لیے مضمون نگاری کا اچھا ذوق بھی پیدا کرلیا، لکھنؤ کے ماہنامہ "رضوان" اور امرتسر کے "مسلمہ" میں ان صاحبزادیوں کے مضامین شائع ہوئے، علاوہ ان آخری صاحبزادی کے سب نے حضرت مولانا علی میاںؒ کی حیات میں وفات پائی، اور انھوں نے اپنی نمناک آنکھوں سے ان سبھوں کو رخصت کیا، اہلیہ محترمہ مولانا سید محمد واضح حسنی ندوی نے ۱۴۲۵ھ کے اواخر میں انتقال کیا، تکیہ رائے بریلی میں مدفون ہیں، غفر اللہ لھا ورحمھا رحمۃ واسعۃ، فرزند وحید مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی مدیر تحریر "تعمیر افکار" رائے بریلی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کی یہی پانچ صاحبزادیاں تھیں جو حیات رہیں، دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کا طفولیت میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔

(۱) حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے صاحبزادۂ گرامی مولانا سید محمد الحسنی معروف بہ "سید محمد میاں" رحمہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحبؒ کے فرزند وحید واصغر ہیں، ان کے بعد ڈاکٹر صاحب کی پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی، ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے رسم بسم اللہ ادا کرائی، جو مولانا مرحوم کے لیے ایک بڑی خوش نصیبی اور شرف کی بات تھی، ڈاکٹر صاحبؒ نے تعلیم کا اصول ان کے لیے جداگانہ رکھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء یا کسی اور درسگاہ بھیجنے کے بجائے گھر پر تعلیم دینے کا بندوبست کیا اور خود ہی تعلیمی مراحل طے کرائے، البتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجات میں خاص طور پر حدیث شریف کی بڑی کتابوں میں شاہ حلیم عطا صاحب کے درس میں سماعت کے لیے بیٹھے۔

علمی استعداد پختہ تھی اور عربی و اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، قلم میں بڑی قوت و جولانی تھی، حال یہ تھا کہ آغاز جوانی ہے اور قلم اپنے پورے شباب پر، خطابت و اسفار سے مزاجاً مناسبت نہیں رکھتے تھے، زیادہ عمر نہیں پائی، صرف ۳۴ بہاریں دیکھیں کہ سانحۂ ارتحال پیش آگیا، بیماری بھی چند گھنٹوں کی تھی، صبح بیمار ہوئے، شام کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، صرف پورے خاندان کو ہی نہیں علم و ادب کے تمام شیدائیوں اور اسلام کی اشاعت و ترقی کے خواہشمندوں، عرب ہوں یا عجم، سب کو سوگوار و غمزدہ چھوڑ گئے، بڑے نیکوکار اور نیک طبیعت واقع ہوئے تھے، شاید ہی کسی کو آپ کے قول و عمل سے ذرا بھی تکلیف ہوئی ہو، رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ وادخلہ فی جنّت النعیم۔

دو مجلّے عربی "البعث الاسلامی" اور اردو کا "تعمیر حیات" جو دونوں اس وقت ندوۃ العلماء کے ترجمان ہیں، آپ کی کاوشوں کا نتیجہ اور یادگار ہیں، کئی کتابیں تصنیف کیں اور کئی کا عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ ایسا کیا جیسے کہ کتاب اسی زبان میں لکھی گئی ہو، اہم تصنیفات میں "الاسلام الممتحن" (عربی)، سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، تذکرہ شاہ علم اللہ، روداد چمن (اردو) ہیں۔

تین فرزند مولانا سید عبداللہ حسنی، مولانا حافظ سید عمار محمد عبدالعلی حسنی، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی اور زوجۂ محترمہ سیدہ زکیہ مرحومہ بنت ڈاکٹر سید حسن مثنی حسنی مرحوم کو پیچھے چھوڑا، اہلیہ محترمہ بھی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شریک ہوجاتے، حالانکہ لکھنؤ میں نہیں رائے بریلی میں تھا، عرض کیا کہ آپ کی خوشی و خواہش کے بغیر بھی اگر مجھ کو اطلاع ہوجاتی تو نکاح خواندگی میں ضرور شریک ہوتا۔

صاحب الفرقان (۱) نے اسی شادی کی سادگی کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کی نسبت جو تحریر فرمایا ہے کہ ''فطری کمزوریوں کے مواقع پر بھی فراق سنت کو عزیز نہ رکھتے۔'' (۲)

اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تصور میں نہ آنے والی سادگی و بے تکلفی کے جو مناظر صاحبزادیوں کے عقد میں دیکھے جاتے تھے، ان کی نظیر لکھنؤ کے پر تکلف گراں بار اور رسموں میں جکڑے ہوئے ماحول میں کیا معنیٰ، کسی دور افتادہ کو روا نہیں اور ڈاکٹر صاحب سے کسی بدرجہا کم وجاہت وحیثیت والے سے بھی قطعاً ناقابل تصور ہے، عقد کے دن بلکہ وقت تک گھر سے باہر بالکل پاس و پڑوس والوں میں بھی شاید کسی کو کچھ سن گن لگ جاتی ہے کہ آج ڈاکٹر صاحب کے یہاں کوئی شادی ہے، مسجد کے نمازیوں میں بھی بعد نماز عین نکاح ہونے سے پہلے کم ہی کسی کو خبر ہوئی ہوگی۔

بہ ایں ہمہ چوں کہ چوتھی صاحبزادی (۳) میں عقد خاندان کے باہر عزیزوں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اپریل ۱۹۹۳ء کو وفات پا گئیں، رحمہا اللہ تعالیٰ وغفرلہا مغفرۃ تامۃ، یہ تینوں علمی دعوتی کاموں میں مصروف رہ کر ایک مقام اور شناخت رکھتے ہیں، مولانا سید عبداللہ حسنی صاحب ندوی کو حضرت مولانا علی میاں ندوی نے اپنی وفات سے چند دن قبل اجازت وخلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

(۱) صاحب الفرقان سے مراد مدیر ''الفرقان'' مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی فرزند اکبر مولانا محمد منظور نعمانیؒ ہیں، جو آج کل لندن میں مقیم ہیں، دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف، ایک طویل عرصہ تک ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی ادارت کی، اب ان کے برادر خورد مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی صاحب کے زیر ادارت نکل رہا ہے اور ان کے بھانجہ مولانا محمد یحییٰ نعمانی ندوی ان کے شریک ادارت اور اس کے مرتب ہیں۔

(۲) ملاحظہ ہو، رسالہ الفرقان، شمارہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ۔

(۳) چوتھی صاحبزادی باعتبار عقد نہ کہ باعتبار ولادت، مراد اہلیہ مولانا سید محمد طاہر بن سید محمد یوسف منصور پوری ہیں، ان کے صاحبزادہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء علم وفضل میں مشہور ہیں، ناظم جامعہ سید احمد شہیدؒ ملیح آباد اور جمعیۃ شباب الاسلام کے صدر ہیں، اور حضرت سید شاہ نفیس الحسینی لاہوری (م ۵؍فروری ۲۰۰۸ء) اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے مجاز بیعت وارشاد بھی ہیں۔

میں ہو رہا تھا، اور نوشہ کے والد وغیرہ دو چار اور اعزہ بھی آئے تھے، اس لیے یقین تھا کہ اور کچھ نہیں تو آج کم از کم پلاؤ تو ضرور ہی کھانے میں آئے گا، لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے مذاق سنت کو عزیز رکھنے والے پر آج ایسے موقع پر بھی فطری کمزوری کیسے غلبہ پاسکتی تھی، بس وہی گوشت روٹی اور سادے چاول آج بھی تھے۔ (۱)

شیخ و مرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے لیے اہتمام

روزمرہ ممدوح کے کھانے میں معمولاً ایک ہی سالن رہتا، مہمان وہ بھی محترم سے محترم اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا (سید حسین احمد صاحب) مدنیؒ (۲) تک کے لیے اضافہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک سالن ہی کا اور ہو جاتا۔

(۱) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تقریروں اور مجالس اس سادگی اور سنت کے پاس ولحاظ کی قابل اس شادی کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس کی برکات میں ان کی اولاد کا خصوصیت سے ذکر فرماتے۔

(۲) شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے کبار اولیاء اللہ، مجاہدین اسلام، خادمین دین وملت اور علماء ربانیین میں سے تھے، ۱۹ رشوال ۱۲۹۶ھ کو قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے، آبائی وطن ٹانڈہ تھا جو اودھ کے مشہور شہر فیض آباد میں واقع ہے۔

نسباً سادات حسینی سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد ماجد مولانا سید حبیب اللہ مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ مجاز تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (م ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) کے تلمیذ رشید اور بعد میں ان کے ملی، قومی اور علمی و دینی کاموں میں رفیق و معاون رہے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) سے بیعت ہو گئے تھے کہ ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب نے مدینہ منورہ کا ہجرت کی نیت سے قصد فرمالیا، آپ بھی ہمراہ گئے اور مکہ مکرمہ میں اپنے شیخ الشیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ (م ۱۳۱۷ھ) کے زیر تربیت چند ماہ رہ کر اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے، دو سال بعد آپ پھر حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں ہندوستان تشریف لائے اور تکمیل سلوک کی اور پھر ان کے خلفائے کبار میں ہوئے، اور ایک ڈیڑھ سال خدمت میں رہ کر واپس مدینہ منورہ حاضر ہوئے، جہاں پھر آپ کا سلسلۂ درس و تعلیم وسیع ہوا۔

مولانا سید محمد میاں مرحوم سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند لکھتے ہیں: "سلسلہ درس نے وسعت اختیار کی تو حدیث و تفسیر اور فقہ کی چودہ پندرہ کتابوں کا درس دیتے تھے، یہ سلسلۂ درس تہجد کے بعد سے شروع ہو کر نماز عشاء تک جاری رہتا تھا۔" (حیات شیخ الاسلام ص/ ۲۷، طبع اول)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

حاجت مندوں کی امداد، صدقات وخیرات میں اخفاء اور سبقت

کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں کیا ہوتا کہ صدقات وخیرات کے مواقع پر خود یہ تنگدل کبھی ہزاروں ہزار بینک بیلنس رکھ کر بھی کبھی ڈاکٹر صاحب کی گرد کو نہ پاسکا، جن کے پاس دو چار سو بھی شاید جمع ہو پاتے ہوں، مصارف باغ کے سلسلہ میں ہمیشہ ہی اس کا اندازہ ہوتا رہتا کہ سو دوسو روپے بھی یک مشت جب کوئی خرچ آگیا تو راقم نیاز مند ہی اس کو اپنی عین سعادت جان کر پیش کر دیتا کہ آہستہ آہستہ ادا کر دیں گے، ورنہ مصارف خیر کا رنگ تو یہ تھا کہ خود اپنی مسلسل چھ ماہ کی علالت کے دوران میں جب کہ ایک طرف مطب بند اور دوسری طرف بیماری کے اخراجات دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک محرر صاحب جو غریب خود اسپتال میں پڑے تھے، اور بال بچوں کو فاقہ تک کی نوبت تھی، اسپتال سے باہر کی قیمتی دواؤں وغیرہ کے علاوہ بال بچوں کی بھی برابر بلکہ مستقل ماہوار تنک کی صورت میں مدد فرماتے رہے، مجھ کو بھی ایسے مواقع پر ضرور متوجہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مسجد نبویؐ میں درس حدیث کی خدمت تنگی وعسرت کے باوجود توکلا علی اللہ انجام دی، کچھ زمانہ اسارت میں اور بقیہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے فرائض انجام دینے اور ملت اسلامیہ کی قیادت ورہنمائی میں گذرا، حجاز مقدس ہی میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کے ساتھ آپ بھی گرفتار ہوئے اور مالٹا میں ایک مدت اسیر رہے، حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد آپ کو ان کا جانشین تسلیم کرلیا گیا، متعدد بار جیل جانا پڑا تحریک خلافت اور آزادی ہند میں آپ کی نمایاں خدمات رہیں، جمعیۃ علماء ہند کے صدر آخر وقت تک رہے، اور دارالعلوم دیوبند میں مسند حدیث پر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی جگہ رونق افروز ہوئے، اور آخر وقت تک اس جلیل القدر عہدہ پر فائز رہے، ہزاروں کی تعداد میں آپ کے مسترشدین وتلامذہ ہیں، آپ کے ہاتھ پر اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر بیعت وتوبہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، حضرت مولانا عبدالباری ندوی اور حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب رحمہما اللہ آپ سے ہی بیعت ہیں، ان دونوں کی آپ کی نگاہ میں بڑی وقعت وحیثیت تھی، دونوں کو ہی اجازت وخلافت سے بلند سمجھا کہ ایک کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے اور دوسرے کو اپنے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء/۱۲؍جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ کو دیوبند میں وفات پائی، اور احاطۂ قاسمی میں اپنے استاذ جلیل مجاہد کبیر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے پہلو میں مدفون ہوئے، اور نماز جنازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ مہاجر مدنی نے پڑھائی۔

فرماتے رہتے، مگر اپنا حصہ ظاہر نہ فرماتے، اتفاقاً کبھی معلوم ہو جاتا، تو میرے دس بیس کے مقابلہ میں ان کے سو پچاس ہوتے۔

آمد وخرچ کا معاملہ اور اخفاءِ حال

ڈاکٹر صاحب کی آمدنی اور خرچ کا معاملہ بھی ایک معمہ تھا، اور رکھنا بھی اس کو کچھ راز میں چاہئے، حتی کہ غایت بے تکلفی کے باوجود مجھ کو بھی کبھی استفسار کی جرأت نہ ہوتی، بس ایک آدھ بار ایسا فرمایا کہ جب کوئی خرچ بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سامان فرما دیتا ہے، چار دن قبل شفاء الملک خواجہ شمس الدین صاحب مدظلہ(۱) خاکسار کی عیادت کو تشریف لائے، ذکر زیادہ تر ڈاکٹر صاحب کی بیماری کا رہا، اسی سلسلہ میں دریافت فرمایا کہ ایک طرف مسلسل بیماری کے باعث مطب بالکل بند، دوسری طرف بیماری کے بڑھے ہوئے مصارف، یہ سب کیسے پورے ہوتے ہیں، میں نے کہا: یہ سوال باہر والوں میں سے سب سے زیادہ خود میرے دل میں پیدا ہونا چاہئے تھا اور ہوتا رہا، مگر ڈاکٹر صاحب کی غیور طبیعت کی وجہ سے ہمت نہ پڑی، اب انشاء اللہ خود ان سے نہ سہی تو علی میاں سے ضرور پوچھ لوں گا، وفات ایسی اچانک ہوئی کہ علی میاں سلمہٗ سے بھی موقع بعد ہی کو ملا، تو فرمایا کہ ان کی آمدنی وخرچ کا پتہ تو مجھ کو بھی کبھی نہیں

---

(۱) مدظلہ، اب رحمہ اللہ، مولانا عبد الباری ندوی نے جب یہ سطور قلم بند فرمائیں اس وقت شفاء الملک حکیم شمس الدین صاحب حیات تھے، شفاء الملک مرحوم بڑے حاذق طبیب تھے، اور کامیاب معالج، لکھنؤ وطن ومسکن تھا، ہر طبقہ میں معروف تھے، اور لوگوں میں مقبول بھی، قرآن کریم بہت اچھا یاد تھا، پابندی سے تراویح سناتے رہے، عربی درسیات کی تکمیل فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے زیر تلمذ رہ کر کی، اور شرف بیعت وارادت بھی آپ ہی سے رہا، منقولات ومعقولات دونوں میں کمال حاصل تھا، اذکار واشغال کے بڑے پابند رہے، اور آخر میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اجل حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری سے تعلق قائم کر لیا تھا۔

سادہ مزاج تھے، لباس وطعام اور ہر چیز میں سادگی پسند فرماتے، جبکہ آپ بڑے خوشحال تھے، ۱۹۷۱ء میں رحلت فرمائی، حلق کا کینسر مرض وفات بنا، رحمہ اللہ تعالیٰ وغفر لہ، ملاحظہ ہو، معاصرین از مولانا عبد الماجد دریابادیؒ ص/۲۱۱، ووفیات ماجدی، ص/۲۲۱-۲۲۳۔

چلا، حد ہوگئی کہ بھائی وہ بھی علی میاں جیسے بھائی تک کو اس کی کانوں کان خبر نہیں۔(۱)

---

(۱) شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹۹۹ء) جو حضرت علی میاںؒ کے نام سے ہندوستان میں معروف ہیں، ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے برادر خورد ہیں، آپ دونوں بھائیوں کی عمر میں ٹھیک ۲۰ سال کا تفاوت ہے، ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ یکم دسمبر ۱۸۹۳ء کو اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۵؍دسمبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے، جمعہ کا دن تھا، ۶؍محرم ۱۳۳۲ھ، حضرت مولاناؒ (جو عالم اسلام کی ممتاز و نامور شخصیت اور بڑے عالم ربانی و شیخ وقت تھے، اور اپنے علمی کمالات، تصنیفی خدمات، بلند افکار و خیالات، دینی و دعوتی جذبہ اور تڑپ، سوز و گداز، زہد و تقویٰ میں دنیا کے چپہ چپہ میں پہچانے جاتے تھے) اپنے برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب علیہ الرحمہ کو بہت عزیز تھے۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۹ سال تھی، ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی آغوش تربیت میں پرورش پائی، انھوں نے آپ کی تعلیم و تربیت کا ایسا اچھا بندوبست کیا اور ایسی صحیح رہنمائی فرمائی کہ جس کا نتیجہ اب اس شکل میں ظاہر ہے کہ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دنیا میں مشہور و مقبول ہیں، عالم اسلام کا سب سے بڑا ایوارڈ (فیصل ایوارڈ) آپ کو عطا کیا گیا، آپ کی کتابیں مختلف ملکوں کی جامعات و مدارس میں داخل نصاب ہیں، ندوۃ العلماء کے ناظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر اور رابطہ عالم اسلامی کے بانی رکن اور رابطہ ادب اسلامی کے بانی و صدر اول تھے، اسلاف کے منظور نظر و محبوب رہے اور خیر السلف بن کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

اور اب جبکہ کتاب کا جدید ایڈیشن ہمارے سامنے ہے، ان کی وفات کو بھی ۹ سال گذرنے کو ہیں، وفات سے ایک سال قبل حکومت دبئی کی طرف سے انٹرنیشنل اسلامی شخصیت ایوارڈ بھی آپ کو دیا گیا، ایک کروڑ سے اوپر رقم پیش کی گئی، اسی وقت وہ رقم آپ نے دینی تعلیم اور دعوت کے کام کے لیے وقف کردی، اور اپنی ذات کے لیے ایک حبہ بھی اس میں سے لینا گوارہ نہیں کیا، پھر سلطان برونائی ایوارڈ ملا، اسے ان کی نذر کردیا جن کا انھوں نے اپنے اوپر حق جانا تھا۔

وفات کا واقعہ پیش آیا، دن جمعہ کا ملا، وقت وہ ملا کہ جمعہ کی پوری تیاری کرچکے تھے، اور اس کے لیے جو اہتمام کرتے تھے، وہ اہتمام بھی کرچکے تھے، وقت موعود آجانے کے آثار محسوس کئے، سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت شروع کردی، بشارت و رحمت و مغفرت کی آیات سے مبشر ہوکر داعی اجل کو لبیک کہا، ۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ/۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء تھا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے تکیہ کلاں رائے بریلی میں نماز جنازہ پڑھائی، ڈیڑھ لاکھ سے زائد افراد تھے، یہ ایک محتاط اندازہ ہے، حضرت شاہ علم اللہ حسنی کے حظیرہ میں مدفون ہوئے، جہاں حضرت شاہ کے علاوہ دیگر علماء کبار اور مشائخ عظام اور خصوصی افراد خاندان مدفون ہیں، جن میں خود ان کے والد، خسر، خالہ، بھائی صاحب، بھتیجے، بھانجے اور دونوں بہنیں بھی ہیں، حجاز مقدس خبر پہنچی تو خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز کی طرف سے ۲۷ ویں شب کو دونوں حرموں میں نماز جنازہ غائبانہ پڑھائے جانے کا اشارہ آگیا، اس طرح لاکھوں لاکھ افراد نے ایسی جگہ جہاں ایک نماز ایک لاکھ اور دوسری جگہ مسجد نبویؐ میں پچاس ہزار سے زیادہ اجر والی ہوجاتی ہے، نماز ادا کی اور دعاء کی، اور اس کا اثر دنیا کے اور حصوں پر بھی پڑا، (بقیہ برصفحہ دیگر)

صبر و رضا، توکل اور اصابت رائے اور حزم و احتیاط

رزق و معاش کے معاملہ میں حضرت مرحوم کا خالص ایمانی و اسلامی رنگ ان کا بڑا متوازن توکل ہی تھا، کہ ایک طرف جائز ظاہری اسباب کی ضرورت کی فکر و تدبیر فرماتے، ان میں کوئی کمی و کوتاہی ہوجاتی تو اس کا تدارک فرماتے، مگر دوسری طرف نظر ہر حال میں مسبب الاسباب پر ہی رہتی کہ بڑے سے بڑے نقصان کی صورت میں بھی قلب وقالب پر کبھی کوئی نمایاں اثر نہیں دیکھا۔

ایک باغ ہی کے معاملات میں بالکل خلاف توقع طرح طرح کے نقصانوں کی صورتیں پیش آتی رہیں (۱)، امکانی تدارک ضرور فرماتے رہے، لیکن زبان پر صبر و

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) اور جگہ جگہ سے ملک ملک سے ایسی اطلاعات آنے لگیں، دونوں حرموں میں پورے اہتمام سے آپ کا نام آپ کے مقام کے لحاظ کے ساتھ لیا گیا، اور بعد میں خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز نے ان کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو مکتوب بھی ارسال فرمایا جس میں اہتمام کی تاکید کا خصوصیت سے ذکر تھا، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کو یہ مقام کیونکر ملا، اس کی مختلف توجیہات کی جائیں گی، لیکن جس بات کی طرف وہ اشارہ کر گئے ہیں وہ ان ہی فرشتہ صفت انسان بھائی اور عظیم مربی و معلم کی تربیت اور فکری رہنمائی کا اثر ہے، جس کو جب وہ یاد کرتے تو پھر ان کے لیے جذبات پر قابو پانا مشکل ہوجاتا تھا، آنکھیں نم ہوجاتیں، اور آواز بھرّا جاتی، وہ ایک صاحب سلسلہ بزرگ بھی ہوئے، ان کے چالیس کے قریب مجازین بیعت وارشاد ہیں، اور ان گنت تلامذہ، اور جنھوں نے علم حدیث میں اجازت لی، عرب و عجم میں ان کی بھی ایک بڑی تعداد ہے، رحمه الله رحمة واسعة وأدخله في العليين مع النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا.

آپ حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے سانحۂ وفات کے دن جو ۷؍ مئی ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ میں ان کی رہائش گاہ پر پیش آیا، سہارنپور کے سفر پر تھے، ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کو اس بات کا اندیشہ رہا کرتا تھا، اس لیے انھوں نے پہلے ہی اپنے عزیز بھانجہ مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کو وصیت کی کہ "علی" اکثر سفر پر رہتے ہیں، وہ نہ ہوں تو تم نماز پڑھانے میں تکلف نہ کرنا، چنانچہ حضرت مولانا جب سفر سے لوٹے تو رائے بریلی میں حظیرۂ شاہ علم اللہ میں تدفین ہوچکی تھی، پہلی نماز جنازہ بڑے عالم و بزرگ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے پڑھائی اور دوسری تکیہ شاہ علم اللہ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے پڑھائی، غفر اللہ ورفع درجاتہ وادخلہ فی جنت النعیم۔

(۱) باغ مختلف جگہ لگوائے لکھنؤ میں محب اللہ پور میں جو سیتاپور روڈ پر واقع ہے، حضرت مصنف علیہ الرحمہ کے زیر اشتراک باغ لگوایا، اسی طرف اشارہ ہے، اب وہ باغ نہیں رہا، اور زمین فروخت ہوگئی ہے۔ لکھنؤ ڈیولپمنٹ اتھارٹی (L.D.A.) کی ترقیاتی اسکیم کی زد میں وہ آرہا تھا۔

رضا کی شان کے خلاف کوئی لفظ آتے کبھی نہیں سنا، لوگوں کی بدمعاملگی کے تجربات کا خود اپنے اور ندوہ وغیرہ کے سلسلہ میں ذکر بہت تأسف سے فرماتے، لیکن اس تأسف میں بھی تأثر خود اپنے ذاتی نقصانات کے بجائے عموماً اور خصوصاً مسلمانوں کے روز افزوں معاملاتی واخلاقی بگاڑ کا زیادہ ہوتا، ثبوت اس کا یہ تھا کہ کسی نقصان پہنچانے والے کے ساتھ کوئی انتقامی صورت کبھی بھی اختیار نہ فرماتے، البتہ حزم واحتیاط کا حق پورا پورا ادا فرماتے، سات آٹھ سال قبل راقم الحروف کے پاس کچھ نقد پس انداز تھا، قرض دینے کا صدقہ سے بھی بڑھ کر سنت کا ثواب حاصل کرنے کی توفیق ملتی رہتی، دلالت خیر کا واسطہ ڈاکٹر صاحب بھی کبھی کبھی ہو جاتے مگر احتیاط اتنی فرماتے کہ ایک مرتبہ ایک بڑے پرانے ندوی ...... وخاندانی تعلقات رکھنے اور روزہ نماز والے صاحب کی مروت میں ان کو قرض دینے کی سفارش تو فرمادی، لیکن مجھ کو کچھ آمادہ دیکھ کر ساتھ ہی زور دے کر فرمایا کہ سفارش اور مشورہ کا فرق تو آپ جانتے ہیں، تب میں چونکا، پھر اس سلسلہ میں بڑے قلق اور بعض مثالوں کے ساتھ فرماتے رہے، کہ روزہ نماز والے مسلمانوں میں بھی شاذ ونادر ہی معاملات میں کوئی قابل اعتماد ملتا ہے، اور اب تو حاجی اسمگلروں کے حج تک کی حقیقت کا راز آئے دن فاش ہوتا رہتا ہے، بس ''انا للہ وانا الیہ'' ہے، اس کے بعد بھی ہم مسلمانوں کی تنزلی یا مصائب ومشکلات کے اسباب ہمارے مصلحین کہاں کہاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، یہ مجسم دنیادار، ڈاکٹر صاحب کی دیندارانہ دنیاداری ہی کا بہت زیادہ معتقد تھا، دنیا کے کم وبیش تمام چھوٹے بڑے معاملات میں ان سے مشورہ لیتا، خصوصاً جب لیے کہ حضرت حکیم رحمۃ اللہ علیہ (۱)

---

(۱) مراد حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، مظفر نگر ضلع کے قصبہ تھانہ بھون میں ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے، دار العلوم دیوبند میں تکمیل درسیات کی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ آپ کے خاص اساتذہ میں تھے، جن سے آپ کو قرب واختصاص تھا اور ان کی آپ پر عنایات وتوجہات تھیں، حضرت گنگوہی سے آپ نے بیعت کی درخواست بھی کی تھی، لیکن انھوں نے اسے اس لیے قبول نہ فرمایا کہ آپ اس وقت زیر تعلیم تھے، (بقیہ برصفحہ دیگر)

کی ایک ہدایت یہ بھی کہ کسی دیندار اور سمجھدار خیر خواہ سے اپنے معاملات میں مشورہ ضرور کرتے رہا کرو، عام وصایا میں بھی حضرت کے یہ داخل کہ بغیر مشورہ کے کوئی کام نہ کیا جائے، میں نے ایک عریضہ میں عرض کیا، کہ میرے مستقل مشیر ڈاکٹر صاحب ہیں، تو بہت خوش ہوئے کہ ایسا مشیر کس کو ملتا ہے۔ شاید ہی کسی امر میں ممدوح مرحوم کے مشورہ ورائے سے ہٹنے کی ضرورت وصورت پیدا ہوئی ہو۔

ایمانی استقامت

انسان کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ دنیا کو عین دین بنا کر دکھلائے، فرشتوں کی نظر انسانی خلقت کے غالباً صرف افادی پہلو پر پڑی تھی، اس کے جواب میں جو یہ ارشاد ہوا تھا کہ ﴿إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾(۱) اس کا

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے جو حضرت گنگوہی کے بھی شیخ تھے آپ کو داخل سلسلہ فرما کر چند سالوں کے بعد خلعت خلافت سے بھی سرفراز فرمایا، حاجی صاحب علیہ الرحمہ اپنے وطن تھانہ بھون سے ہجرت فرما چکے تھے لیکن دیرینہ خواہش تھی کہ تھانہ بھون کی یہ خانقاہ آباد رہے۔

حضرت تھانویؒ جامع العلوم پٹکاپور کانپور میں مدرس تھے، خوش اسلوبی سے وہاں سے علاحدہ ہو کر تھانہ بھون میں خانقاہ امدادیہ میں تصنیف وتالیف اور تعلیم وتربیت میں مشغول ہو گئے اور آپ کے حلقہ بگوش کبار علماء وفقہاء، حکماء وعقلاء اور عصری علوم سے تعلیم یافتہ بڑی تعداد میں ہوئے اور آپ سے استفاضہ کر کے عالم کو مستفیض کیا، اس سلسلہ میں خاص طور سے علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، شاہ عبد الغنی پھولپوریؒ، ڈاکٹر عبد الحی عارفیؒ، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ، مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مولانا عبد الباری ندویؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، مولانا ظفر احمد تھانویؒ، شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا شاہ ابرار الحق صاحب حقیؒ اور مولانا اسعد اللہ رامپوری ناظم مظاہر علوم سہارنپور وغیرہم قابل ذکر ہیں، بیک واسطہ خلفاء میں بھی کئی ایسے ہیں جو رشد وہدایت کے شمس وقمر بن چکے ہیں، ایک نام حضرت قاری صدیق احمد باندویؒ کا ہی لے لینا کافی ہے، دوسرے حضرات میں مولانا شاہ عبد الحلیم صاحب جونپوری، مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سہارنپوری اور مولانا حکیم اختر صاحب کراچوی بھی شہرت ومقبولیت رکھتے ہیں۔

جہاں تک تصنیفات وکتب ورسائل کا تعلق ہے، تو صغیر وکبیر سب ملا کر جن میں مواعظ وملفوظات بھی شامل ہیں، ۹۰۰ تک پہنچتے ہیں، ان میں صرف ایک ''بہشتی زیور'' ہی کافی شافی ہے، آپ کا سانحۂ وفات ۸۲ برس کی عمر میں رجب ۱۳۶۲ھ کو پیش آیا، اور تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں خلد نشیں ہوئے۔

(۱) سورۂ بقرہ آیت/ ۳۰۔

کم از کم ایک اشارہ کیا عجب ہے اس حقیقت کی طرف بھی رہا ہو کہ ہر طرف سے ہر طرح کی دنیاوی و مادی ترغیبات وتحریصات میں گھرا ہو کر اور ہر وقت نفس وشیطان سے جنگ کرتے ہوئے ہزاروں لاکھوں میں ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ کی صفت والا ایک ڈاکٹر عبد العلی بھی نکل آئے تو کیا وہ معصوم الخلقت ہزاروں لاکھوں فرشتوں پر بھاری نہ ہوگا؟!

ڈاکٹر صاحب کی بے داغ دیندارانہ دنیاداری کی کن کن باتوں کو یاد کیا اور یاد دلایا جائے، ان کی یہی مثالی اسلامیت تھی، جس نے نہ اموالی واولادی امتحانوں سے فرار یا ترک وتجرد کا مشورہ ان کو دیا نہ کسی اموال واولاد کو ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فتنہ بننے دیا(۱)، دین واسلام کی پوری تاریخ میں وقت کا سب سے بڑا فتنہ جدید تعلیم ہے، خدا کی شان دیکھئے کہ اس فتنہ کی انتہائی ارتدادی خطرناکیوں پر بھرپور گرفت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ پہلے پہل چونکانے کا پورا حق خود اسی تعلیم کے ایک بڑے مستثنیٰ فرزند سعید ڈاکٹر رفیع الدین(۲) نے اپنی کتاب ''قرآن اور علم جدید'' میں ادا کیا، حتی کہ اس سے چونک کر ہمارے حضرت علی میاں سلمہ ''یک انار وصد بیمار'' ذات بابرکات کو کم از کم اپنے قلمی جہادوں میں ایک مستقل محاذ کا اضافہ کرنا پڑا، بارک اللہ فی برکاتہم۔

ظاہر ہو جانے پر بھی ہمارے جدید تعلیم والوں میں دین سے یک گونہ

---

(۱) آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاللّٰهُ عِنْدَهٗ أَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ سورۂ تغابن آیت/۱۵ کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ مبلغ ومفکر اور مصنف تھے، متعدد اہم کتابیں لکھیں، انگریزی اخبارات میں بھی لکھتے تھے، بالآخر بذات خود اقبال اکیڈمی کراچی سے ایک سہ ماہی رسالہ انگریزی میں نکالنا شروع کیا، اسلام کی اشاعت کا جذبہ اور لوگوں کے اسلام میں تیزی سے داخل ہونے کا آپ کے اندر بڑا شوق تھا، اس کی فکر بھی رکھتے تھے اور برابر اس کے لیے کوشاں بھی رہتے، ۱۹۶۹ء میں کراچی میں بالکل اچانک کہ دفعتہ رکشہ سے گرے اور وفات پاگئے۔ (ملاحظہ ہو، معاصرین ص/۲۰۷، از مولانا عبد الماجد دریابادی)

نو آموزانہ یا نو مسلمانہ اجنبیت جھلکتی رہتی ہے، ڈاکٹر صاحب کے علاوہ کوئی دوسری مثال ایسی دیکھنے میں قطعی نہیں آتی، جس کے دین پر اس اعلیٰ تعلیم کا ابتدائے طالب علمی سے انتہائے زندگی تک کوئی ظاہری و باطنی ادنیٰ سے ادنیٰ اثر بھی محسوس کیا گیا ہو، معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اسکول وکالج کے آس پاس ہو کر کبھی گذرے ہیں، لیکن اپنی اس ایمانی استقامت کا امتحان ممدوح نے سب سے بڑھ کر اولاد کے معاملہ میں دیا۔(۱)

(۱) اولاد کی تعلیم وتربیت میں کوتاہی کا کیا سوال، کسی دوسرے معلم ومربی کے حوالہ کرنا بھی گوارہ نہ کیا، اپنی ہر بیٹی اور پھر لخت جگر فرزند اور پورے گھر کے چشم وچراغ مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی تعلیم خود ہی دی، اپنے مشغول ترین اوقات میں سے اہتمام سے اس کے لیے وقت فارغ کرتے، اور طریقۂ تعلیم ایسا تھا کہ بہت جلد قرآن مجید سمجھنے کے یہ سب قابل ہوگئے، بعد میں مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کو حدیث کی اونچی کتابوں کے درس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں خصوصیت سے محدث ندوۃ العلماء مولانا شاہ حلیم عطا سے استفادہ کے لیے بٹھایا، خارجی مطالعہ میں بھی پوری نگرانی رکھتے اور ہر کسی کی کتاب پڑھنے نہیں دیتے۔

تعلیم وتربیت

اولاد کی تعلیم وتربیت میں عمومی لاپرواہی اور اس کے نقصانات

بڑے بڑے صلحاء ومعلمین اور خاندانی علماء ومشائخ تک اس طرح بے دھڑک اپنی اولاد کو اس ارتدادی خطرہ کے حوالہ کردیتے اور اپنی آنکھوں سے، دینی صورت وسیرت سب کے بگاڑ کو اس بے حسی سے دیکھتے رہتے ہیں کہ گویا ان پر نہ اس کی کوئی دینی ذمہ داری ہے اور نہ اخروی مواخذہ، یہی رنگ خود اس تعلیم کے استثنائی افراد کا دیکھا، جو اپنی ذات سے کم از کم روزہ نماز کی بدنی عبادات میں تہجد واشراق اور اوراد ووظائف تک جا پہنچے ہیں، مگر اولاد کے معمولی روزہ نماز کی بھی فکر نہیں، اور اس تعلیم کے ذریعہ اس کی دینی ہلاکت کو دنیا کی چند روزہ وہ بھی غیر یقینی چھوٹی بڑی نوکریوں چاکریوں وغیرہ کی قیمت پر بے تحاشا خریدتے چلے جاتے ہیں، وجہ بظاہر اس ستم ظریفانہ تضاد عمل کی وہی ہے کہ دنیاداری کو عین دینداری بنانے والے اسلام کا تصور واثر ذہنوں میں پوجاپاٹ کے دین کا قائم ہوگیا ہے، وہ بھی زیادہ تر انفرادی ونجی نوعیت کا، اس کے لازماً دینی ترقی کے معنی بھی یہی رہ گئے کہ ایک طرف روزہ نماز کے انفرادی نوافل ومستحبات اور اوراد ووظائف کے ذاتی مشاغل میں ترقی کرلی جائے، اور دوسری طرف اولاد کے فرض روزہ نماز تک کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد نہ جانی جائے، اس لیے جدید تعلیم کے کھلے ہوئے دین دشمن راستہ پر بلا کسی جھجھک اور کھٹک کے پوری بے فکری بلکہ بے رحمی کے ساتھ اولاد کو ڈال دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی فکرمندی اور ترجیحات

ڈاکٹر صاحب کے ذکر خیر کے سلسلہ میں یہ ذکر اس لیے کر دیا گیا کہ شاید ان کی مثالی (آئیڈیل) مثال سے ہمارے ان بھائیوں کو کم از کم اپنی اولاد ہی پر ترس کھا کر کچھ چونک پیدا ہو جو خود اپنی آخرت و جنت کی فکر سے الحمد للہ غافل نہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کو چھوڑ کر اکیلے ہی جنت چلے جانا چاہتے ہیں، آپ اس سے پہلے ''الفرقان'' ہی میں پڑھ چکے ہیں کہ:

> ''دامادوں کی تلاش میں آج کی ایک عام کمزوری یہ ہے کہ اچھے اچھے دیندار اور نائبان انبیاء تک لڑکیوں کے دنیاوی عیش و آرام کی خاطر ان کے رشتہ میں دینداری کی تلاش کو نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ ہی کو دیکھا کہ دنیاوی تعلیم، دنیاوی وجاہت، دینی عزت و عالی نسبی کے جامع ہوتے ہوئے پانچوں صاحبزادیوں کے رشتہ میں ایک نگاہِ غلط انداز بھی ان مواقع پر نہیں ڈالی، جوان معزز حیثیات کا جامع ہونے کی بدولت دنیوی اعتبار سے اچھے رشتوں کے حصول میں ان کو حاصل ہو سکتے تھے۔''(۱)

دامادوں سے بڑھ کر مسئلہ اکلوتے صاحبزادہ (زوّدہ اللہ فی الدنیا والآخرۃ) کی تعلیم کا تھا، لیکن جس قلب پر معصیت کا خطرہ تک نہ گذر پاتا ہو، وہ اپنی کسی اولاد کے قلب و قالب سب کو اسکول وکالج کے ارتدادی طوفانی خطرات میں جھونک دینا کیسے قبول کر لیتا، اسکول وکالج کی جدید دنیوی تعلیم کا ذکر کیا ڈاکٹر صاحب کے

---

(۱) یہ تاثر مدیر ''الفرقان'' مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب کا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں: ''کتنی عظیم قربانی ہے، آج کل کے ماحول میں، معیار سنت کے خاطر اپنے لخت ہائے جگر کے دنیوی عیش و آرام کے امکانات کو قربان کر دینا، اور کس پائے کا اخلاص ہے، اپنے دین اور عشق رسالت میں۔'' (ملاحظہ ہو، رسالہ الفرقان شمارہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

﴿قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً﴾ (۱)والے ذمہ دارانہ احساسات نے تو قدیم دینی تعلیم کے کسی مدرسہ حتیٰ کہ خود دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی داخل کرنا پسند نہ فرمایا (۲) اس باب میں ان کی اس قدر احتیاط واہتمام کو دیکھ کر یورپ کے مشہور فلسفی برکلے کی نانی کا یہ مقولہ یاد آجاتا ہے، اگر پہلے یاد آجاتا تو ان کو سناتا بھی، جو اپنے شوہر کی وفات پر اس نے اپنے لڑکے کو لکھا تھا کہ:

''تمہارے باپ نے تم کو مزدور معلموں کے سپرد کبھی نہیں کیا۔''

ہمارے اسکول وکالج تعلیم گاہوں سے زیادہ امتحان لینے اور سند دینے کی فیکٹریاں ہیں، خود یونیورسٹیوں کے ذاتی تجربات کے بعد ان کے طالب علموں سے کہنے ہی لگا تھا کہ یہاں علم کے لین دین سے زیادہ کام سندوں اور تنخواہوں کے لین دین کا ہوتا ہے، آپ لوگ سندیں لینے آتے ہیں اور ہم مزدور معلم تنخواہیں لینے، نہ صحیح معنی میں آپ علم لینے آئے ہیں اور نہ ہم دینے، لیکن کسی سے اور کیا کہا جائے۔

تعلیم وتربیت میں انوکھا اور نادر طریقہ کار اور اس کے اثرات

ہمارے ڈاکٹر صاحبؒ ایک طرف دینی تعلیم گاہوں کی تربیتی خامیوں کو خوب جانتے اور ان کا ذکر فرماتے رہتے، دوسری طرف ﴿قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً﴾ والی اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس فرماتے، اس لیے عمر بھر ناظم ندوۃ العلماء رہ کر

---

(۱) سورۂ تحریم آیت/۶۔

(۲) انسانوں کی نفسیات اور ان کے اثر قبول کرنے اور اثر ڈالنے کی صفت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اولاد کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لیں، جبکہ ان کی اولاد اچھا اثر قبول کرنے والی اور اثر ڈالنے والی خصوصیت کی حامل تھی، پھر بھی اس خطرہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ بقول ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے: انسان تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ ہوتے ہیں جو جس ماحول میں جاتے ہیں اسی کے ہوجاتے ہیں، یہ پچاس فیصدی ہیں، دوسرے وہ ہیں جو صحیح حالت پر رہتے ہیں جہاں کہیں بھی رہیں ان پر خیر غالب رہتا ہے، اور تیسری وہ قسم ہیں جو غلط ڈگر پر ہی چلتے ہیں اور ان کی طبیعت اچھا اثر قبول کرنے سے مانع رہتی ہے، وہ فرماتے تھے کہ یہ دونوں پچیس فیصدی ہوتے ہیں۔ (روایت جد محترم ومعظم جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب مدظلہ)

بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کے بہانے ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيْرًا﴾ (۱) کا تربیتی حق جیسا انھوں نے اپنی اولاد کے حق میں بہ نفس نفیس خود ادا فرمایا، اس کی مثالیں اب امت کے خواص میں بھی شاذ ونادر ہی ملیں گی، ابتدائی تعلیم بھی براہ راست اپنی نگرانی میں گھر پر استاد رکھ کر دلواتے، وہ بھی خالی کتابی استاد نہیں، اچھا مؤمن صالح ہوتا، پھر آگے کی تعلیم کی بسم اللہ بذات خود ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ سے کراتے، جس انوکھے طرز سے کراتے اس کے موجد وعامل تمام تر خود ہی تھے، یعنی قواعد یا صرف ونحو کے ایک حرف کے بغیر علم قرآن کے ساتھ ساتھ ہی زبانی قرآن بھی سکھلاتے جاتے، اس طرح کہ بچوں کی قصہ پسند فطرت وسہولت کے مد نظر پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصے پڑھاتے، حضرت علی میاں سلمہ کو قصص النبیین (۲) کی ترتیب وتالیف کی رہنمائی غالباً حضرت مرحوم کے اس طرز خاص سے ملی، صرف ونحو کی تعلیم پر ہمارے عربی مدرسوں میں جتنا زور دیا جاتا ہے، میں بھی اس کو وقت وقوت کی اضاعت ہی جانتا تھا، لیکن سرے سے استغناء کا سبق ڈاکٹر صاحب ہی سے پڑھا، باقی خود اپنی اولاد پر جس

---

(۱) سورۂ اسراء آیت/۲۴۔

(۲) کامل کیلانی مصری کی کتاب "حکایات للأطفال" (جو ممالک عربیہ میں مقبول تھا ہی مدارس اسلامیہ میں بھی رائج ہو چلا تھا، انداز سیکولر، قصے جانوروں کے اور تصاویر کی بھرمار تھی) نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو متوجہ کیا جس وقت انھوں نے اپنے بھتیجہ مولانا محمد میاں مرحوم کو پڑھتے دیکھا جب انھوں نے عربی پڑھنا شروع کی تھی، اور دینی مدارس میں پڑھائی جاتے دیکھا، جس کا خود انھیں بھی تجربہ ہوا تھا، کہ بچوں کے لیے عربی میں ایک ایسا سلسلہ نصاب ترتیب دیں جس کی زبان آسان ہو اور غیر شعوری طور پر اسلام کے بنیادی عقائد کی تلقین اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہو جائے، یہ سلسلہ جب سامنے آیا تو ممالک عربیہ اور مدارس اسلامیہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور داخل نصاب کیا، مشہور عرب فاضل اور مفکر وادیب سید قطب شہیدؒ نے اس سلسلہ کو سراہتے ہوئے کہا کہ "میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہمارے وضع کیے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔"

اس کے پانچ حصے ہیں، تیسرا حصہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے، اور آخری حصہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، یہ سلسلہ مختلف زبانوں میں متعدد ملکوں سے شائع ہو کر مقبول عام ورائج ہے، حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اس کتاب کی سبب تالیف اور اہمیت پر اپنی کتاب "قصص النبیین" کے مقدمہ اور "کاروان زندگی" حصہ اول میں روشنی ڈالی ہے۔

کامیابی کے ساتھ انھوں نے اس کا تجربہ فرمایا اس کی وہ بالکل مستثنیٰ آپ اپنی مثال تھے، اور صاحبزادہ سلمہ ماشاء اللہ عربی وانشاء وادب میں اس کامیابی کی ایسی جیتی جاگتی یادگار ہیں کہ انشاء اللہ عرب وعجم کے معلم منشی وادیب اپنے عم محترم (حضرت علی میاں سلمہ) کے نام کو چار چاند لگائیں گے۔(۱)

مربیانہ نفسیاتی فہم وفکر

تعلیم سے بھی بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی تربیتی فہم وفکر کی شان جیسی اسلامی و یگانہ تھی اس کے اندازہ کے لیے چند خطوط ہی کافی ہیں، جو "الفرقان" کی بدولت منظر عام پر آگئے ہیں، سمجھ یہ رکھا تھا کہ راقم حروف سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کو اندر باہر سے جاننے پہچاننے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو، لیکن ان خطوط کو پڑھ کر یہ خوش فہمی بھی بس خوش فہمی نکلی۔

دورِ حاضر اپنے زیر تربیتوں یا زیر نگرانوں کی جیسی مربیانہ نفسیاتی فہم وفکر کی گہرائی

---

(۱) مؤلف کی یہ دعا ہے، اللہ نے جسے قبول بھی فرمایا، اللہ نے آپ کے قلم میں ایسی قوت وتاثیر دی اور آپ کو وہ فہم عمیق اور فکر سلیم دی کہ آپ کی تحریروں نے عربوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، قومیت عربیہ کے فتنہ کو ایسی ضرب ماری کہ وہ ٹوٹ کر رہ گیا، اس فتنہ کے علمبردار مصر کے صدر جمال عبدالناصر کو اس کا احساس ہوا، چنانچہ مصر کا سفارت خانہ چیخ اٹھا، اور مولانا محمد الحسنی مرحوم کو طلب بھی کیا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو ظالموں کے شر سے محفوظ فرمایا، اور کتنوں کے زیغ وضلال سے بچنے یا نکل آنے کا ذریعہ بنایا، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

ڈاکٹر صاحب کا تعلیم کا یہ انوکھا طریقہ جو انھوں نے اپنے فرزند مولانا محمد الحسنی صاحب پر اپنایا، ابتداء سے ہی بڑا موثر رہا کہ ابھی ان کی عمر ۷-۸ برس کی رہی ہوگی کہ قرآن مجید کو سمجھنے لگے تھے، عربی کے ممتاز ادیب اور عالم مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں جو مولانا محمد الحسنیؒ کی تعزیت میں لکھا تھا: "محمد الحسنی وضو کر رہے تھے، عمر ۷-۸ سال کی ہوگی، یا اس سے بھی کم، ڈاکٹر صاحب موجود تھے، انھوں نے فرمایا: محمد کو قرآن کا ترجمہ آتا ہے، آپ جہاں سے چاہیں امتحان لے لیں، میں بڑا حیران ہوا، میں نے چند آیات پڑھیں، محمد میاں نے بالکل صحیح ترجمہ کیا، مجھے مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔" اور لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب نے اپنے طرز خاص سے انھیں قرآن کریم کے ذریعہ عربی پڑھائی تھی، قرآن کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ عربی زبان جس قدر آسانی سے قرآن کے ذریعہ پڑھائی جاسکتی ہے کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔"

(مکتوب ۹ر جولائی ۱۹۷۹ء)

کے ساتھ نگرانی فرماتے، اس کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے اپنے برادر عزیز از جان (مولانا علی میاں سلمہ) کے نام ایک ہی خط کی چند مختصر ہدایات و سوالات کو پڑھ لینا کافی ہوگا۔

"اپنے چوبیس گھنٹہ کے پروگرام سے مطلع کرو، اور یہ بھی لکھو کہ جمعرات جمعہ کو سبق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ان ایام کے علاوہ بھی کسی مسئلہ پر گفتگو کا موقع ملتا ہے یا نہیں؟ یہ بھی لکھو کہ حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملتا ہے؟ جہاں رہتے ہو، وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں، اور وہ کس قسم کے لوگ ہیں؟

جب تم وہاں گئے تھے اسی وقت سے اب تک اپنے میں کوئی تغیر محسوس کرتے ہو یا نہیں؟ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مفصل جواب لکھو، تاکہ کوئی بات نہ رہ جائے۔"(۱)

صرف یہ سوالات ہی کیسے عمیق مربیانہ و نفسیاتی نظر کا پتہ دے رہے ہیں۔(۲)

---

(۱) کتاب ہذا کے حصہ خطوط میں خط کے باقی مندرجات ملاحظہ ہوں۔

(۲) ڈاکٹر صاحب کی مربیانہ تفسیاتی فہم و فکر برابر کام کرتی رہتی، اس کے واقعات ہی اگر جمع کر لیے جائیں تو مستقل کتاب ہوجائے، سب سے اہم چیز ان کے یہاں نیت کا استحضار تھا، ایک بار اپنی صاحبزادیوں کو کپڑے عنایت کئے اور یہ تاکید کی کہ ایک بہن دوسری بہن کا سیئے اور یہ نیت کرے کہ اس میں دوسرے کے تعاون کا ثواب ملے گا، اسی طرح ایک بار شیروانی کا ایک کپڑا ایک بیٹی کو یہ کہہ کر دیا کہ میری شیروانی تم سیؤ، دامادوں میں ایک کے کپڑوں کی دھلائی آپ کی دھلائی کے ساتھ لی جانے لگی تو یہ تاکید کی کہ جن کے کپڑے ہیں ان سے ہی دھلائی لی جائی، پھر ان ہی داماد سے آپ کے نواسہ کے پھوڑے کے آپریشن کا معاملہ آیا تو اس کا پورا خرچ خود ہی برداشت کیا، اسی طرح گھر میں دیر رات میں آنے کی ممانعت تھی، گھر بند کر دیتے پھر کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ کھولتا، اور مضر صحت چیزوں کے استعمال پر سخت روک ٹوک تھی، چائے تک کو پسند نہیں فرماتے تھے، گھر کے باہر وقت گذاری، دوست واحباب کی تلاش بھی ان کے نزدیک اخلاقی جرم تھا، محض تفریح کا کام بھی گوارہ نہ تھا، سرزنش فرماتے اور اس میں دل رکھنے کے روادار نہ ہوتے، اور وقت کے ضیاع کی کوئی صورت اپنے سامنے پیدا نہ ہونے دیتے، ریڈیو کا سننا بھی ان کے نزدیک وقت کا ضیاع تھا، مگر اخبارات کا مطالعہ کرتے اور کراتے، عالم عربی کے اخبارات وجرائد بھی منگاتے تاکہ دنیا کے حالات سے صحیح واقفیت ہو اور عالم اسلام کے لیے درد پیدا ہو، اولاد کے علاوہ ان کے زیر تربیت ان کے بھی بھانجے رہے، ان پر بھی ان کے یہ سبھی اصول جاری ہوئے۔

دینی، دعوتی واصلاحی مقام

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے مناسبت

ایک اور بڑی خوش فہمی بعض احباب واکابر کی پسندیدگی وناپسندیدگی کے باوجود اپنا بس ایک نشہ کا مغلوبانہ حال یہ بن گیا ہے کہ دین کیا دنیا تک کی کوئی گفتگو تھانہ بھون کے پیر مغاں کا نام لیے بغیر نہیں بن پڑتی، وجہ یہ کہ دق کے ایک آخری درجہ کے مریض کو جس حاذق معالج سے اللہ تعالیٰ نے کم از کم اتنا کر دیا ہو کہ بستر پر پڑے پڑے زندگی کی سانسیں لے رہا ہو، اس کی معمولی انسانیت کا تقاضا ہے کہ اپنے پرانے مریضوں کو موقع آنے پر ایسے معالج کی حذاقت کے اپنے ذاتی تجربات تو سنا ہی دے، ورنہ ان کے حق میں سوا بدخواہی کے کس جرم کا ارتکاب ہوگا۔

خدا گواہ ہے کہ راقم احقر ظاہر وباطن کے دینی امراض کا ایسا ہی آخری درجہ کا دق زدہ بیمار تھا، اور اب اللہ تعالیٰ ٹوٹے پھوٹے ایمان کی سلامتی کے ساتھ خاتمہ ومغفرت فرمادیں تو امت کے اس حاذق حکیم کے علاج نیز دوسرے بزرگوں کی دعائی توجہ ہی لے دے کر اپنا سارا سرمایہ نظر آتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے سامع ومخاطب کو پاکر اپنے اس مغلوبانہ حال پر کیسے قابو پاسکتا، ہاں چوری چوری اور طویل طویل مجالست کا موضوع حکیم الامت علیہ الرحمہ کی علمی وعملی، تعلیمی وتربیتی، اصلاحی وتجدیدی، دیدہ وخواندہ باتیں رہتیں، بات بات پر ممدوح کے شرح صدر کی کیفیت ومسرت چہرہ سے نمایاں رہتی، کتابیں بھی حضرت کی پڑھتے، دوسروں خصوصاً صاحبزادہ سلمہ کو تاکیدی مشورہ دیتے،

سلسلہ تجدید (۱) کی کتابیں پیش کرنا مؤلف اپنی سعادت ہی جانتا، مگر وہ پڑھنا زیادہ تر حضرت ہی کی چیزوں کو پسند فرماتے، آخر میں ایک دن خود ہی تجدید تصوف کی خصوصاً بڑی داد دینے لگے، میں نے کہا یہ تو اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب ہے، اور برسوں پہلے آپ کو پیش ہو چکی تھی، فرمایا، اس وقت تو نظر سرسری ہی ڈالی ہوگی، لیکن ادھر بعض تازہ خلجانوں میں پڑ کر از سر نو غور سے پڑھی، تو بہت زیادہ قدر ہوئی اور الحمدللہ کوئی خلش باقی نہیں رہی، مجھ کو کم ہی کسی طویل و عریض داد و تحسین سے اتنی خوش فہمی ہوئی ہوگی جتنی ان کے گنتی کے ان چند لفظوں سے کہ ''تم نے پڑھا بھی خوب حضرت کی چیزوں کو اور سمجھا بھی خوب۔''

جامعیت اور فہم سلیم

اب خوش فہمی عرض کرنے کی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات تک حضرت (تھانویؒ) کے ساتھ ان کی اس عقیدت میں زیادہ کیا تمام تر حصہ اپنی سعادت کا جانتا رہا، لیکن ان خطوں کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ پیدا ہی تھانوی مزاج و مذاق کو لے کر ہوئے تھے، اور ہمارے حضرت علی میاں سلمہ نے اپنے برادر معظم و مربی کے ان خطوں کی چند سطری تمہید میں ان کی شخصیت کا تعارف ماشاءاللہ ''جامعیت اعتدال و توازن، فہم سلیم و رسوخ فی الدین'' کے چند جامع الفاظ میں فرما دیا ہے۔(۲)

---

(۱) یہ چار کتابیں ہیں، تجدید تصوف و سلوک، تجدید تعلیم و تبلیغ، تجدید دین کامل، تجدید معاشیات کے نام سے ہیں، ان کی تصنیف میں مؤلف نے استفادہ تو اپنے مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تعلیمات سے ہی کیا ہے مگر جا بجا اس کی روشنی میں اپنا نقطہ نظر بھی بیان کرتے گئے ہیں، تجدید دین کامل میں حضرت تھانویؒ کے تجدیدی کارناموں کا خلاصہ پیش کیا ہے، اس کا دوسرا نام جامع المجددین ہے، اور تجدید تصوف و سلوک میں باطنی و اخلاقی اصلاح سے زیادہ بحث کی گئی ہے، ان دونوں کتابوں پر مولانا سید سلیمان ندوی کا جامع مقدمہ ہے، تجدید تعلیم و تبلیغ میں تعلیم اور اس کے مقصد اور طریقہ کار اور نتائج و اسباب سے بحث کی گئی ہے، اور تجدید معاشیات میں پورا نظام معیشت بلکہ معاشیات کی نئی تشکیل آ گئی ہے، یہ چاروں جامع اور مؤثر و مفید کتابیں ہیں۔

(۲) وہ لکھتے ہیں: ''برادر معظم و مربی ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلی صاحب مرحوم کی شخصیت جامعیت، اعتدال و توازن، فہم سلیم، رسوخ فی الدین، دینی حمیت، اخلاص و للٰہیت اور قدیم و جدید کے محاسن کا جو (بقیہ بر صفحہ دیگر)

یہی کانٹے کی تول، اعتدال وتوازن، علم وعمل پر مبنی ہیں، خاص الخاص تھانویؒ رنگ تھا، اور یہی اسلام کی ساری ایمانی وعلمی تعلیمات والی صراط مستقیم ہے، کہا ہی کرتا ہوں کہ علوم وفنون تحقیقات وتالیفات کے دینی دفاتر کا مسئلہ نہیں، الحمدللہ ایمان واخلاص، فلاح وتقویٰ والے دینی رجال تو اس گئے گذرے زمانہ میں بھی امت میں عنقا نہیں، عنقا جو چیز دور دور امت میں ہر جگہ ملے گی وہ اعتدال وتوازن اور فہم سلیم ہی ہے، ورنہ جوش وجذباتیت، افراط وتفریط تو گویا اب صراط مستقیم والی امت کا خاص مزاج وامتیاز بن گیا ہے، فہم سلیم نام ہی دین ودنیا کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات میں سلامتی کی راہ سمجھ اور پالینے کا ہے، عبقری ذہن والوں کی ذہانت بالعموم یک رخی ہوتی ہے، یعنی کسی ایک طرف تو ان کا ذہن بہت تیز چلتا ہے اور بہت دور تک نکل جاتا ہے لیکن ایسا ذہن عملی زندگی کے لیے ناکارہ ہی نہیں خطرناک ہوتا ہے، کہ اس کی یک رخی نظر ایک ہی پہلو پر زیادہ رہتی ہے، جس سے غلو وافراط کے مفاسد پیدا ہونا لازم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا ذہن متنوع یا بھڑکتا ہوا بالکل نہ تھا، بڑا ٹھنڈا تھا، مجھ کو گوناگوں تعلقات کی بدولت آئے دن ہی اس کے تجربات ہوتے رہتے کہ ہر معاملہ کو بڑے ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچتے اور بڑی سلامتی کی رائے اور مشورہ دیتے، لیکن ان خطوط سے معلوم ہوا کہ ان کے اکثر فضائل وکمالات کی طرح فہم سلیم کی دولت بھی، دین ودنیا، معاش ومعاد سب کی کسبی سے زیادہ وہبی یا حضرات انبیاء علیہم السلام والے رنگ کی تھی۔

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) نادرالوجود نمونہ تھی اس کا اندازہ ان کی خاموشی وبےنفسی کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھنے والوں کو بھی نہیں ہے، اس کے لیے ایک دفتر اور ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، لیکن کتاب میں بھی وہ بات کہاں سے آسکتی ہے، جو ان کی آغوش تربیت میں پرورش پانے والے کے تأثرات ومشاہدات میں ہے۔"
(ملاحظہ ہو، الفرقان لکھنؤ جلد ۲۸ شمارہ ۱۲)

اصل یہ ہے کہ دین یا معاد کی فہم درست ہو تو دنیا یا معاش کی سمجھ آپ سے آپ درست ہونا ہی چاہئے، تابع کی درستی بڑی حد تک قدرتاً متبوع کی درستی کے تابع ہوتی ہے۔

طلب معاش رضا جوئی کی وجہ سے ضروری ہے

ممدوح مرحوم ابھی طالب علم ہی ہیں لیکن اس سن وسال کو دیکھئے اور معاشی و مادی فہم سلیم (جس کا کچھ ذکر اوپر بھی آچکا ہے) کہ سمندر کو تین جملوں کے کوزے میں اپنے والد ماجدؒ کے نام ایک عریضہ میں کس طرح بند فرما دیتے ہیں کہ:

> ''طلب معاش اسی حیثیت سے ضروری ہے کہ رضا جوئی بغیر اس کے ممکن نہیں ......اس لیے یہ اسی حد تک ضروری ہے، جس حد تک رضا جوئی، اس کے بعد اگر یہ رضا جوئی بھی ممکن نہ ہو تو مباح ہے، اور اگر اوقات عزیز کو ضائع کرے تو حرام ہوگا۔''

اس رضا جوئی ہی کے تحت بقدر ضرورت معاش کے انتظام کے بعد خالص رضا جوئی کے اعمال میں صوم وصلوٰۃ وغیرہ کی عبادات کے بعد سب سے مقدم اعلاء کلمۃ اللہ، رشد وہدایت خلق کی خالص انبیائی خدمات کو رکھا ہے، اس کی لگن ان کو اس درجہ تھی کہ اب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ(۱) کی تبلیغی خدمات کا

---

(۱) داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بانی جماعت تبلیغ ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوائے، آپ کے والد ماجد مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ بڑے اہل دل اور عالم ربانی تھے، جبکہ آپ کی والدہ ماجدہ صفیہ بی بھی بڑی پاک سیرت، جید حافظہ اور بڑی ذاکر شاغل خاتون تھیں۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ابتدائی تعلیم وطن کاندھلہ میں ہوئی، اور والد صاحب کے پاس بستی حضرت نظام الدین میں، ابتداء سے ہی آپ پر مشائخ وقت اور اکابر علماء کی نظر شفقت وعنایت تھی، مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ''جب میں مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو ہمیں صحابہؓ یاد آجاتے ہیں، حدیث کی تعلیم آپ نے خاص طور سے اپنے بھائی مولانا محمد یحیٰؒ کاندھلوی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی سے حاصل کی، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں چند سال تدریس کے فرائض انجام دیئے، (بقیہ بر صفحہ دیگر)

بہت محدود دائرہ سے باہر کوئی چرچا نہ تھا، مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب نے غالباً اپنی معاشی زندگی اور ندوہ کے تعلق کے اوائل میں یقیناً اس طرح کی اندر ہی اندر اس حد تک بنیاد ڈال لی تھی کہ ایک دو مبلغ برابر اس کام میں لگائے رکھتے (۱)، خصوصاً ایسے نام کے مسلمانوں میں جن میں بہتوں کے نام بھی مسلمانوں جیسے نہ ہوتے۔

دعوتی و تبلیغی کوششیں

ندوہ کے مقاصد میں ابتداء ہی سے ایک شعبہ تبلیغ کا تھا، مگر کاغذ سے باہر شاید ہی کبھی کوئی صورت اس کی دیکھی گئی ہو، ڈاکٹر صاحب نے اندر ہی اندر اس میں

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) پھر بستی حضرت نظام الدین آگئے۔ دین کا درد اور تڑپ جو آپ کے دل میں تھی اس نے کسی پل آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا، باوجود تنگی وعسرت اور مشکلات کے آپ نے دعوت دین اور اصلاح امت کے کام کا آغاز میوات سے کر دیا، اس میں آپ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، پھر اس کام کو چند اصول پر مرتب ایک شکل دے کر اور کام پھیلتا چلا گیا، جماعتیں نکلنے لگیں، علماء، دانشور اور عہدیداران سب اس میں لگنے لگے، اور یہ کام اپنا میدان وسیع کرتا گیا، یہاں تک کہ یہی بستی نظام الدین دہلی اس بابرکت کام میں پوری دنیا کا مرکز ہے، اللہ تعالیٰ قائم و جاری رکھے، اور اس کے افادہ کو اور عام کرے، آمین، جولائی ۱۹۴۴ء کو وفات پائی۔

(۱) اس میں سکندر صاحب کا نام خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے جنھیں ڈاکٹر صاحب نے استفادہ کے لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں بھی بھیجا تھا، اس سے متعلق مکتوب حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے ذخیرۂ خطوط میں آج بھی محفوظ ہے، پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے انھیں بھٹکل (کرناٹک) بھی کچھ وقت کے لیے بھیجا تھا جب وہاں کی ضرورت سامنے آئی تھی، اسی طرح مولانا نجم الدین شکیب ندوی مرحوم بھی ان مبلغین میں تھے اور اللہ نے ان سے بھی بڑا کام لیا، یہ رائے بریلی کے ہی ایک علاقہ تھولینڈی کے رہنے والے تھے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب کے حقیقی معنوں میں نور نظر اور لخت جگر حفید اکبر مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بتایا کہ ایک دن کچھ لوگ آئے، ان سے ملے اور اپنے خاندان و برادری کے افراد کے اسلام لانے سے متعلق بتایا کہ یہ سب ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اور ان کے مبلغین کا ذکر کیا جو انھیں آکر دین سکھاتے تھے، نام پوچھے جانے پر سکندر صاحب اور نجم الدین صاحب کے نام بھی بتائے، البتہ یہ بھی بتایا کہ رابطہ کمزور ہو جانے سے یہ نقصان ہو رہا ہے کہ ہم میں جس کی جہاں شادی ہو جاتی ہے وہ انھیں میں ہو جاتا ہے، الحمد للہ اب یہ لوگ واپس وہیں آگئے ہیں جہاں سے انھیں روشنی ملی تھی اور یہ لوگ ان فکر مند دادا کے دل درد مند رکھنے والے پوتے کے رابطہ میں ہیں، جو اپنے ان عظیم دادا کے اس دعوتی و ایمانی درد و غم کو لے کر چپہ چپہ پھر رہے ہیں، اور دستر خوان اسلام پر آنے والے نئے نئے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔

اس طرح جان ڈالی کہ مالی شرکت کی سعادت بھی خاص خاص اخلاص واعتماد والوں کو ہی ملتی ورنہ زیادہ تر یہ بھی خود ہی حاصل فرماتے۔(۱)

تبلیغی جماعت سے تعلق

پھر جب بستی حضرت نظام الدین دہلی کی تبلیغی جماعت کا کام پھیلا تو ڈاکٹر صاحب کی گویا منہ مانگی مراد مل گئی، اس کے سیری گشتوں میں بھی شرکت فرماتے، ان ہی کے طفیل میں کبھی کبھی راقم نابکار کو بھی توفیق مل جاتی، اور گو اپنی چشم بدنیت کی نظر میں اجتماعی رنگ کا کام کرنے والی کوئی دوسری جماعت فرنگی رنگ وروش کی نقالیوں اور ان کے مقاصد سے جماعت تبلیغ سے زیادہ پاک نہیں، تاہم جوش وجذباتیت میں اس کی بعض غلو پسندیاں بہت کھٹکتی رہیں، مگر ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس خدمت و جماعت کی جیسی اہمیت وعظمت تھی، اس کے دیکھتے ہوئے ان کے سامنے زبان پر تو

(۱) دعوتی وتبلیغی جذبہ شروع سے آپ کے اندر موجزن تھا، اور خاموشی سے اس کی فکر رکھتے اور ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داریوں کے بعد یہ احساس اور زیادہ بڑھا، متعدد ایسے ندوی فضلاء تھے جن کو آپ مختلف دیہاتوں وغیرہ میں بھیجتے جہاں تھوڑی بہت بھی پیاس محسوس کرتے، چنانچہ یہ لوگ وہاں جا کر دین کی باتیں بتاتے اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کے تعارف کا کام کرتے، ڈاکٹر صاحب کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی، چنانچہ ان کی کوششوں سے متعدد غیر مسلم بچے مسلمان ہوئے اور ان کو آپ نے ندوہ میں تعلیم دلائی جو بعد میں شہرت یافتہ ادیب وعالم بنے، جن میں خصوصیت سے ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی مرحوم (جامعہ ملیہ دہلی) اور مولانا سلمان ندوی سابق ایڈیٹر "الدعوۃ" دہلی کے نام قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ بھی اور کئی نام ہیں جن کے نام اور کام کو دیکھ کر لوگوں کو یہی احساس ہوتا تھا کہ یہ پشتینی مسلمان ہیں، ڈاکٹر صاحب برادران وطن کے پسماندہ طبقات اور اچھوتوں میں بھی جاتے اور اسلام کا پیغام مساوات عملی طور پر پیش کرتے، ان کے بڑے داماد اور راقم کے دادا جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب اطال اللہ بقاءہ فرماتے ہیں کہ بعض جگہوں پر میں بھی ان کے ساتھ گیا اور ان کو دیکھا کہ وہ اچھوتوں کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر زمین میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں، اسی طرح وہ مختلف مقامات پر جاتے، ان مسلمانوں کے لیے بھی دعاۃ بھیجتے جو نام کے مسلمان رہ گئے تھے، پھر جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے دعوتی کام کا علم ہوا تو علی میاں (چھوٹے بھائی) کو واقفیت کے لیے بھیجا اور واقفیت حاصل کر لینے کے بعد لکھنؤ کے اپنے دائرہ میں رہ کر عملی طور پر اس تحریک وجماعت کا تعاون کیا، اور دوسروں کو متوجہ کر کے باہر سے اس کام کو تقویت پہنچائی، اور اپنے بھائی مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو اس کام کے لیے فارغ کیا۔

آکر رہ جاتیں، مسرت کے ساتھ حیرت کی حد نہ رہی جب خود ان ہی کی زبان سے کسی موقع پر ان غلو پسندیوں کی ناپسندیدگی کا اظہار ہوا، حیرت بالائے حیرت اس پر ہوئی کہ یہ بعینہٖ اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کی بدولت حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداءً اس کام کی پوری سرپرستی کے باوجود کنارہ کشی فرمالی تھی۔

لکھنؤ میں مجالس تھانویؒ میں شرکت

ڈاکٹر صاحب پر اعتدال وتوازن پسندی کا خالص تھانوی رنگ زیادہ نکھر کر اس وقت سے آگیا، جب حضرت تھانویؒ کا علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ میں طویل قیام ہوا، (۱) اور ڈاکٹر صاحب قریب قریب بلاناغہ ہی حاضر ہوتے، پھر تو مجلس سے اٹھ کر ایسی باتوں تک کو عین عقل ونقل کے مطابق پاتے جو بہتوں کے نزدیک دونوں کے خلاف ہوتیں، ایک دن مجلس میں ایک پروفیسر صاحب نے کوئی ایسا بے ڈھنگا سوال کر دیا کہ حضرت کو خاصی ناگواری ہوئی اور تیز لہجہ میں اس کا اظہار ہوا، مجلس سے اٹھ کر سوالیہ انداز میں ڈاکٹر صاحب کی طرف میں نے دیکھا، لیجئے حضرت کا سب سے بدنام رنگ بھی آپ نے دیکھ لیا، فرمایا: ایسی بے ڈھنگی باتیں ناگوار کسی سلیم الفہم کو کیوں نہ ہوں گی، البتہ ہم مخلوق کے دباؤ میں غم کھا کر رہ جاتے ہیں، لیکن حضرت کا ایسا مخلوق سے کمال استغناء تو اس زمانہ میں دیکھنے میں نہیں آیا، پھر کیوں اصلاح وتادیب کا حق نہ ادا فرمائیں۔

---

(۱) حضرت تھانویؒ بغرض علاج اگست ۱۹۳۸ء میں تشریف لائے اور چالیس روز قیام رہا، مسجد خواص مولوی گنج میں پابندی سے عصر بعد مجلس ہوتی تھی، ایک دن خود اپنی خواہش سے مسجد خواص سے پیدل چل کر ڈاکٹر صاحبؒ کے مکان تشریف لائے، تھوڑی دیر تشریف فرما رہے۔ (ملاحظہ ہو: کاروان زندگی حصہ اول)

اس واقعہ کو محی السنہ حضرت مولانا ابرارالحق حقی رحمۃ اللہ علیہ (ہردوئی) نے بھی بیان کیا ہے، وہ بھی ساتھ تھے۔

جناب وصل بلگرامی صاحب نے اپنی کتاب "حضرت تھانویؒ کا سفر لکھنؤ ولاہور" میں حضرت تھانویؒ کا ڈاکٹر صاحب کے یہاں خود اپنی خواہش سے آنے کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا عبدالباری ندویؒ نے حضرت تھانویؒ سے درخواست کی جو منظور فرمائی، اور ایک رات مولانا عبدالباری ندویؒ کے یہاں بھی قیام فرمایا۔

اب قدر شناسانہ تھانوی فہم دین (کہ وہی صراط مستقیم والا عین دین اسلام ہے) کا مذاق ڈاکٹر صاحب کا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ تھانوی نام ونسبت والوں میں خال خال ہی ملتا ہے، دخل زیادہ اس میں ان کی خداداد سلامتی فہم اور اس غیر متزلزل نیت و عزیمت کا تھا کہ جس چھوٹی بڑی بات کا بھی ان کو کتاب وسنت یا شریعت سے مطلوب و ماخوذ ہونا معلوم ہو جاتا، اس کے خلاف وہ قلبی ناگواری کے ہوتے ہوئے وقتی خاموشی تو اختیار فرما لیتے لیکن عمل میں اس سے دنیا کی کوئی رغبت اور دنیا والوں کی کوئی رعایت ان کو روک نہ سکتی۔

حضرت گیلانی کی فراست اور راقم کی شہادت

یوں بہر حال بشر ہی تھے، بشریت کے لوازم سے خالی کیسے رہے ہوں گے، لیکن جس طرح حضرت گیلانیؒ کا ایمانی فراست والا قلب چند مہینوں میں اس تأثر پر مضطر ہو گیا تھا کہ ایک ایسے شخص کو دیکھا کہ جس کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی شاید گذر پاتا ہو، اس طرح اپنی آنکھوں کے شہتیر سے آنکھیں بند کر کے دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے والا یہ راقم ۳۲ سالہ قریب سے قریب اور نجی سے نجی معاملات و تعلقات پر مبنی تجربات وتاثرات پر مبنی آخر میں پھر اس شہادت پر ختم کرتا ہوں کہ نہ ان کی نگاہ قلب ایک معاملہ میں بھی دین سے ہٹتی دیکھی نہ ان کے قالب کا کوئی فعل وعمل اتفاقی طور پر بھی خلاف دین دیکھا، ذہن پر زور ڈالنے پر بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ کبھی ایسا دیکھا ہو۔(۱)

---

(۱) یہ تو تھی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور حضرت مؤلف علیہ الرحمہ کی فراست اور شہادت، اس کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی دوسرے الفاظ واسلوب میں اس کی شہادت دی ہے کہ: ''معصوم صرف تین ہی دیکھے (شرعی معنی میں نہیں، اردو محاورہ میں) ایک اپنی حقیقی ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ، دوسرے مولوی عبدالرحمٰن نگرامیؒ اور تیسرے یہ حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی، یعنی ایسے سلیم الفطرت اور اس درجہ نیک وصالح کہ گویا دانستہ معصیت ان کے پاس پھٹکتی بھی نہیں۔'' (ملاحظہ ہو، معاصرین از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ) (بقیہ بر صفحہ دیگر)

تفصیل میں جاؤں تو کسی رسالہ کا ضخیم نمبر یا کتاب بھی کافی نہ ہوگی، بس ''بزور بازو نیست'' والی قلب وقالب دونوں کی اس بے داغ زندگی والی سعادت کو خدا بخشندہ کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے: ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْفَعْ دَرَجَاتِهٖ.

●●●●●

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) مدیر الفرقان لکھنؤ لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر صاحب کی صورت ہی دیکھ کر انس وعقیدت پیدا ہوتی تھی، یہ دراصل ان کے باطن کی نورانیت اور جاذبیت کا عکس تھا، جو پوری آب وتاب کیساتھ ان کے چہرے پر نمایاں رہتا تھا، اہل تقویٰ آج بھی اس دنیا میں بہت سے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کو بہت تھوڑی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد دل گواہی دیتا تھا کہ معاصی سے پرہیز کرنا تو الگ بات ہے، ان کے دل میں معصیت کا تصور بھی شاید نہیں آتا۔'' (شمارہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ جلد ۲۸)

ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات

مدیر ''الفرقان'' کے تاثرات (☆)

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے برادر معظم جناب ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلیؒ کی وفات کی خبر ناظرین ''الفرقان'' کو بھی مل چکی ہوگی، خدا غریق رحمت کرے، ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی ذات اور اپنے اوصاف وکمالات کے اعتبار سے ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے، وہ اس خاندان کے چشم وچراغ تھے، جس نے سید احمد شہیدؒ جیسی ناقابل فراموش ہستی ملت کو بخشی، اور اپنے بزرگوں کے امتیازات وکمالات کے جامع بھی۔

اس فرشتہ صفت ہستی (۱) کو ۱۹۴۸ء سے لے کر عین اس لمحہ تک جب اُس کی پاک روح نے اپنے مالک کی طلبی پر لبیک کہتے ہوئے پرواز کی، مسلسل اور بہت قریب

(☆) بانی ومدیر ''الفرقان'' کی حیثیت سے لوگ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ صاحب کو جانتے ہیں، مگر یہاں مراد مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی فرزند گرامی حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ہیں، ان دنوں مولانا سنبھلی کے زیر ادارت ''الفرقان'' نکل رہا تھا، اور سرپرستی ونگرانی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تھی، ان دونوں کا تعلق بڑی محبت وعقیدت کا حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سے رہا اور انھیں آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی خوب ملا، اسی مضمون کا حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے اپنے تاثرات میں جابجا ذکر کیا ہے، ان ہی کے اصرار وتقاضہ پر حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے حضرت ڈاکٹر صاحب پر اپنے دلی تاثرات اور جذبات عقیدت ومحبت قلم کی نذر کیے، اس حیثیت سے حضرت مولانا سنبھلی زید مجدہ کے اس مضمون کو حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کے مضمون کے تکملہ کی حیثیت سے شامل کتاب کیا جارہا ہے، مدیر ''الفرقان'' کا یہ مضمون ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ جلد/ ۲۸، شمارہ ذوالحجہ ۱۳۸۰ھ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ (م)

(۱) حضرت گیلانی، مولانا عبدالباری ندوی کے بعد مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی زید مجدہ نے بھی ''فرشتہ صفتی'' تعبیر ڈاکٹر صاحب کے لیے اختیار کیا، استاذ مکرم ومعظم مولانا محمد زکریا صاحب سنبھلی زید مجدہ نے فرمایا کہ ہمارے سنبھل میں ایک غالی قسم کا بدعتی تھا وہ علاج کے لیے لکھنؤ آیا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوا، ان کو دیکھ کر بیساختہ کہہ بیٹھا کہ یہ تو فرشتہ ہیں، اور کہا کہ ہمیں آپ ہی بیعت فرمالیجئے اور اس قدر متاثر ہوا کہ سچا تائب ہوگیا، اس واقعہ کو استاذ محترم ومعظم مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لوگوں سے بیان فرمایا۔

سے دیکھنے کا موقع ملا، "الفرقان" کا دفتر شروع میں تو سات آٹھ سال تک گویا ڈاکٹر صاحب کے مطب اور دولت کدہ سے بالکل متصل ہی رہا، اس کے بعد جو کچھ فاصلہ بڑھا بھی تو وہ چند قدم سے زیادہ کا نہ تھا، رہائشی مکان بھی پانچ چھ سال تک ڈاکٹر صاحب کے زیر سایہ ہی ملا رہا، اٹھنا بیٹھنا لکھنؤ کے قیام کے روز اول ہی سے ڈاکٹر صاحب کے متعلقین کے ساتھ رہا، اس طرح اپنی بد قسمتی سے گو حاصل کچھ نہیں کیا لیکن خوش قسمتی سے دیکھا بہت کچھ اور جو کچھ دیکھا وہ کبھی بھولنے والا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی صورت ہی دیکھ کر آدمی کو انس اور عقیدت پیدا ہوتی تھی، یہ دراصل ان کے باطن کی نورانیت اور جاذبیت کا عکس تھا جو پوری آب وتاب کے ساتھ ان کے چہرہ پر نمایاں رہتا تھا، اہل تقویٰ آج بھی اس دنیا میں بہت سے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کو بہت تھوڑی ہی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد دل گواہی دیتا تھا کہ معاصی سے پرہیز کرنا تو الگ بات ہے، ان کے دل میں معصیت کا تصور بھی شاید نہیں آتا، وصال کے چند دن بعد ڈاکٹر صاحب کے رفیق خاص و دم ساز حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی (اطال اللہ بقاءہٗ) کی خدمت میں اس درخواست کے لیے حاضری ہوئی کہ آپ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو جتنا جانتے ہیں شاید ہی کوئی دوسرا اس درجہ کی واقفیت رکھتا ہو، لہٰذا جی چاہتا ہے کہ اگر صحت مساعد ہو تو مرحوم کے تذکرے میں کچھ ارقام فرمائیں، بہت سے بندگان خدا کو اس سے دینی فائدہ پہنچے گا، اس صحبت میں ڈاکٹر صاحب کی سیرت کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کا ذکر میں نے چھیڑا ہے مولانا موصوف نے مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا تاثر نقل فرمایا کہ "ایک مرتبہ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں میری ہی تحریک پر علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا علاج شروع ہوا، یہ پہلی ملاقات تھی جو کافی ممتد ہوئی، واپس ہو کر مجھ سے کہا کہ میاں میں

تمہارا شکر گذار ہوں کہ "ایک ایسے آدمی کے دیکھنے کا موقع تم نے میرے لیے فراہم کیا جیسا نہ اب تک ان آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ امید ہے کہ دوسرا دیکھنے میں آئے، میرا تو دل پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ اس شخص کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی نہیں گذرتا"

یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو تھوڑی ہی سی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد پورے جزم و وثوق کے ساتھ یہ تاثر طاری ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی درجہ کی بھی معصیت کا مادّہ ہی اس انسان کے اندر نہیں رکھا ہے، کوئی تارک الدنیا قسم کے انسان نہیں تھے، مطب کرتے تھے، زمین اور باغات کے علائق رکھتے تھے، ایک وسیع کنبہ کے ذمہ دار تھے، ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داریاں تھیں، غرض ہر طرح کے بشری علائق تھے، مگر قول و عمل میں وہ پاکیزگی، وہ طہارت، وہ معصومیت کہ فرشتے بلائیں لیں۔

ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کا اسی طرح کا ایک امتیازی وصف جسے مذکورہ بالا بنیادی وصف کا شاخسانہ کہنا بجا ہوگا، ان کی للّٰہیت اور استحضار عبدیت تھا، ان کے اس باطنی کمال کے یقین سے دل معمور تو تھا ہی مگر مرحوم کا وہ خط دیکھ کر جو عین جوانی کی عمر میں انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا تھا، یہ یقین حق الیقین سے بدل گیا، اللہ اللہ! کیا ٹھکانہ ہے اس للّٰہیت اور استحضار عبدیت کا کہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ایس۔سی۔ کر کے نکلے ہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے نقشہ کے خطوط تیار کرتے ہوئے والد ماجد کو لکھتے ہیں:

صرفِ عصیاں ہوا وہ حصہ عمر
جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

جس کی جوانی میں للّٰہیت اور عبدیت کا یہ رنگ ہو، کیا پوچھنا ہے اس کی پختہ سنی اور بڑھاپے کے رنگ کا، بس للّٰہیت و عبدیت کی ایک موہنی تصویر تھی جو نہ جانے

کب تک آنکھوں میں پھرتی رہے گی۔

اتباع سنت میں بھی اپنے بزرگوں کا پورا پورا ورثہ پایا تھا، سنت اور سنت کے قائم کردہ حدود کی پابندی ہر چیز میں عزیز تھی، انگریزی تعلیم اور ڈاکٹری کے پیشہ میں کامیابی کے باوجود وضع قطع، رہن سہن اور گھر کا چال چلن از اول تا آخر سنت کے حدود کا پابند، ہر طرف ایک دلآویز مسنون سادگی، تکلفات سے دوری، سنت اور حدود سنت ہی نہیں، مذاق سنت کی بھی ایسی پاسداری تھی کہ انسانی کمزوری کے نہایت نازک مواقع پر بھی اس میں فرق نہیں آتا تھا، پانچ صاحبزادیوں پر اکلوتے صاحبزادہ، سب سے چھوٹے اور فطری سعادت کی بنا پر صحیح معنیٰ میں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، لیکن لکھنؤ کے پر تکلف اور گرانبار رواجوں سے جکڑے ہوئے ماحول میں اس شان سے شادی کی تقریب ادا ہوئی کہ جیسے سارا ارمان یہی تھا کہ سنت کے مذاق سادگی کی پیروی کا ایک یہ موقع بھی میسر آئے، بڑا دل گردہ چاہئے ایسے فطری کمزوریوں کے مواقع پر بھی مذاق سنت کو عزیز رکھنے میں۔

لڑکیوں کے رشتے آج کی ایک عام کمزوری ہیں، اچھے اچھے دیندار اور نائبان انبیاء لڑکیوں کے دنیاوی عیش و آرام کی خاطر ان کے رشتے میں دینداری کی تلاش کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اس معاملہ میں راقم نے اپنی محدود نظر سے ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ ہی کو دیکھا کہ دنیاوی تعلیم، دنیاوی وجاہت، دینی عزت اور عالی نسبی کا جامع ہوتے ہوئے پانچوں صاحبزادیوں کے رشتوں میں ایک نگاہ غلط انداز بھی ان مواقع پر نہیں ڈالی، جوان معزز حیثیات کا جامع ہونے کی بدولت دنیوی اعتبار سے اچھے رشتوں کے حصول میں انھیں حاصل ہو سکتے تھے، تمام صاحبزادیوں کے رشتے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ دینی معیار کو شرط اول قرار دیا، اور اس کے ساتھ اگر اپنی جیسی حیثیت کا دنیوی معیار بھی جمع نہیں ہو سکا تو ادنیٰ پرواہ نہیں

کی، کتنی عظیم قربانی ہے آجکل کے ماحول میں، معیار سنت کی خاطر اپنے لخت ہائے جگر کے دنیوی عیش و آرام کے امکانات کو قربان کر دینا، اور کس پائے کا اخلاص ہے اپنے دین اور عشق رسالتؐ میں!

ان اوصاف کا لازمی تقاضا تھا کہ اس شخصیت میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے دردمندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تڑپ بھی ہو، چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا سینہ ان جذبات کا بھی گنجینہ تھا، اسلامی دنیا میں کہیں کوئی ناگوار واقعہ ہوتا تو بالکل طبعی انداز کے رنج کی کیفیت طاری ہوتی، اور کوئی خوش کن خبر ملتی تو طبیعت سرور و نشاط سے لبریز ہو جاتی اور اس کے اثرات دیکھنے میں آتے، مرحوم کے بعض خطوط کا سلسلہ اسی شمارہ سے شروع کیا جا رہا ہے، اس سے اچھا خاصہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سینہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی کیسی تڑپ اور اسلام کے لیے کیسا درد تھا۔(۱)

بزرگوں کی اخلاقی شانیں مختلف ہوتی ہیں، کسی میں خوش اخلاقی کا کوئی رنگ ہے، کسی میں کوئی، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خوش اخلاقی میں ایک عجب باوقار جمال تھا، کشادہ جبینی اور خندہ روئی کے ساتھ ملنے والوں کا استقبال فرماتے، عین سنت کے مطابق پورے رخ کے ساتھ التفات ہوتا، ڈاکٹری کا پیشہ ہونے کی بناء پر وقت بے وقت ان سے ضرورت پڑتی رہتی، ہمیشہ ایک ہی انداز سے متوجہ ہوتے ہوئے پایا، مسجد میں نماز کے بعد کچھ عرض کرتا ہوا تب، مطب سے گھر تک یا مسجد سے گھر تک کے راستہ ہی میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت پڑ گئی تب، اور گھر کی آرام گاہ میں اجازت لے کر جا پہنچے تب، کشادہ جبینی تھی کہ کسی وقت جدا نہیں ہوتی تھی، خاموش اور باوقار چہرہ پر شفقت جیسے بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر حاضری قریب سے

---

(۱) مسلسل تین شماروں میں یہ خطوط شائع ہوئے، جو اب اس کتاب کا حصہ بھی ہیں، مزید ایک خط وہ بھی شامل ہے جو بنام ڈاکٹر صاحب ہے اور ان کے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے ہے، جس سے مدیر "الفرقان" کی اس شہادت و اعتراف کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے، جس کا انھوں نے اپنے اس مضمون میں ذکر کیا ہے۔

قریب تر کرتی اور دل میں محبت کا تعلق ابھارتی، بلا شائبۂ تکلف اس خادم کو تو وہ بالکل اپنے خاندان کے ایک بزرگ محسوس ہوتے، ان کی خاموش مجلس میں جی لگتا اور بغیر کسی ضرورت ہی کے جاکر کچھ دیر بیٹھنے کو دل چاہتا۔

مرحوم اپنی ذات اور اپنے ظاہری و باطنی کمالات سے خود بھی ایک نہ بھولنے والی شخصیت ہیں مگر ایک زندہ (اور انشاء اللہ زندۂ جاوید) یادگار بھی ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں، اور وہ ہیں ہمارے محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مد اللہ ظلہم، مولانا کے والد مرحوم ان کو صرف ۹ رسال کا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، اس دن سے ڈاکٹر صاحب کے روز وفات تک وہ اپنی والدہ محترمہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی کے سایۂ عاطفت میں رہے، اور انھیں کے دامن شفقت میں تعلیم و تربیت کے سارے مراحل طے کیے، مولانا محترم کی آج کی پوری شخصیت انھیں کی تربیت وشفقت کا فیض ہے، اور فیض بھی کیسا جاری فیض، اللہ تعالیٰ اس فیض کو مدتوں جاری رکھے، اور ڈاکٹر صاحب کے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔

کیسا قابل رشک اور قابل تقلید ہے وہ بندہ، جو عمر بھر اپنے دونوں ہاتھوں سے بھی آخرت کمائے اور اپنے بعد بھی اس کمائی کا ایک عظیم ذریعہ چھوڑ جائے، خدا اس کی بال بال مغفرت فرمائے، انبیاء وصالحین کا قرب عطا فرمائے اور پسماندگان کے دلوں پر اپنے فضل خاص سے سکینہ برسائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

عتیق الرحمٰن سنبھلی (☆)

(☆) دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل، ایک عرصہ تک لکھنؤ سے نکلنے والے ماہنامہ "الفرقان" کے مدیر ومرتب رہے، اور اب یہ رسالہ ان ہی کی سرپرستی میں نکل رہا ہے، مرتب ان کے ہی خواہرزادے برادر محترم مولانا یحییٰ نعمانی ندوی ہیں، قیام اب لکھنؤ میں نہیں لندن میں ہے، صحت کے عوارض نے انھیں اس پر مجبور کیا مگر لکھنؤ آتے رہتے ہیں، وطن سنبھل مرادآباد تھا، اس لیے سنبھلی لکھتے ہیں، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کے خلف اکبر اور کئی کتابوں کے مصنف ومشہور عالم دین ہیں، بارک اللہ فی حیاتہ۔

ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم
کے
چند خطوط

مرتبہ: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

[یہ خطوط کا وہ مجموعہ ہے جو مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی وفات کے بعد ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوئے، جس کی طرف حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے اپنی تحریر میں اشارہ کیا ہے، اور اس سے استفادہ کی ترغیب دی ہے، خطوط سے متعلق تمہیدی تحریر اور حواشی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ہیں ان کے حواشی پر ''ع'' کا رمز ہے، اور جہاں کہیں مرتب نے لکھنے کی جرأت کی ہے وہاں ''م'' کا رمز ناظرین پائیں گے۔]

برادر معظم و مربی ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب مرحوم کی شخصیت جامعیت اعتدال و توازن، فہم سلیم، رسوخ فی الدین، دینی حمیت، اخلاص و للّٰہیت اور قدیم و جدید کے محاسن کا جو نادر الوجود نمونہ تھی، اس کا اندازہ ان کی خاموشی و بے نفسی کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھنے والوں کو بھی نہیں ہے، اس کے لیے ایک دفتر اور ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، لیکن کتاب میں بھی وہ بات کہاں آسکتی ہے جو ان کی آغوش تربیت میں پرورش پانے والے کے مشاہدات و تأثرات میں، کسی حد تک خطوط (خصوصاً جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کو لکھے جائیں اور ان کے متعلق کبھی واہمہ بھی نہ گذرے کہ وہ چھپیں گے) اصلی ذہن و خیالات کی ترجمانی کر سکتے ہیں، اور شخصیت کی تصویر پیش کر سکتے ہیں، محض قلب حزیں کو تسکین دینے کے لیے نہیں بلکہ ان کی ذاتی

قیمت اور علمی و تربیتی افادیت کے پیش نظر بھی ان کے چند خطوط پیش کیے جا رہے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ۲۱؍ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ (۷؍مئی ۱۹۶۱ء) کو اچانک ہم نے خدا کی کیسی نعمت کھودی اور ۲۲؍ذی قعدہ، ۸؍مئی کو ہم نے علم و عمل، شرافت نفس، دینی استقامت، اسلامی تہذیب اور رشد و ہدایت کے کس گوہر آبدار اور اسلاف کرام کی کس نادر یادگار کو سپرد خاک کیا، مجھ ناچیز و ننگ وجود کے نام جو شفقت نامے ہیں وہ شفیق والدین، جاں نثار بھائیوں اور مربیوں اور اتالیقوں کے لیے دستور العمل اور چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آخر میں سوائے اس کے کہ اپنے محسنوں اور مخلص دوستوں سے اپنے مثیل پدر استاد و مربی و محسن کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست کروں، ٹوٹے ہوئے دل کو تسکین دینے کا اور کوئی سامان نہیں۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

ابوالحسن علی

۱— سیدی و ولی نعمی متعنا اللّٰہ بحیاتہ (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آداب فدویانہ کے بعد گذارش ہے کہ کمترین بخیر و عافیت ہنسوہ پہنچ گیا، راستہ میں ایک دن کے لیے کانپور میں ٹھہر گیا تھا، حافظ حلیم صاحب تو منصوری پر تھے، ان کے صاحبزادہ اور منشی یٰسین حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، اور انھیں کے یہاں قیام بھی رہا تھا، کانپور میں مسٹر جے. پی. شریواستوا مشیر کیمیائی حکومت صوبجات متحدہ

(۱) یہ خط والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے نام ہے، اور غالباً بی. ایس. سی. پاس کرنے کے بعد لکھا گیا ہے، اس امتحان میں بھائی صاحب پورے کیننگ کالج میں اول اور پوری الہ آباد یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آئے تھے، یہ خط آئندہ کے پروگرام کے متعلق ہے، پڑھتے وقت یہ پیش نظر رہے کہ یہ تحریک خلافت کے شباب کا زمانہ تھا۔ (ع)

واسسٹنٹ ڈائرکٹر صنعت وحرفت سے ملاقات کی تھی، انھوں نے جو مشورہ دیا وہ گذارش کروں گا۔

اپنی آئندہ طرز ماندو بود کے متعلق چار پانچ برس سے غور کر رہا ہوں اور اصولاً میں وہی سمجھتا ہوں جو جناب ارشاد فرماتے ہیں، یعنی مقصد زندگی حیات آخروی ہے، اور دنیا مزرعہ آخرت ہے، اگر دنیا سے مقصود آخرت ہو تو حصول دنیا کے لیے کوشش بھی باعث ثواب ہے، اس حیثیت سے معاملات بھی عبادت بن جاتے ہیں، پھر بھی دونوں میں وہی فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے، ایک مقصود ہے اور دوسرا مقصود کا آلہ، اگر منطقی دلائل سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو عرفان الٰہی وحیات دنیاوی میں جو کچھ نسبت ہے وہ قلب سلیم سے کسی وقت مخفی نہیں۔

صرفِ عصیاں ہوا وہ حصہ عمر
جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

عرفانِ الٰہی کے بعد ایک انسان کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ اپنے اوقات خدائے عزوجل کی رضا جوئی میں صرف کرے، اور حقیقت میں یہ عرفان کامل کے لیے ایک امر لازم ہے، طلب معاش اس حیثیت سے ضروری ہے کہ رضا جوئی بغیر اس کے ممکن نہیں، اس لیے یہ اسی حد تک ضروری رہے گی، جس حد تک یہ رضا جوئی کے لیے کارآمد ہو، اس کے بعد اگر رضا جوئی میں مخل نہ ہو تو مباح ہوگی، اور اگر اوقات عزیز کو ضائع کرے تو حرام ہوگی۔

رضا جوئی کے لیے جن اعمال کی ضرورت ہے ان میں بھی فرق مراتب ہے، سب سے مقدم وہ اعمال ہیں جو محض ذکر الٰہی وتزکیہ باطن پر مشتمل ہیں مثلاً صوم وصلوٰۃ، حج وتلاوت، اس کے بعد وہ اعمال ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ وہدایت خلق پر مشتمل ہیں مثلاً جہاد واستعداد للحرب و وعظ وتذکیر، اس کے بعد وہ اعمال ہیں جو

عامۃ المسلمین کے منافع دنیاوی پر مبنی ہیں مثلاً زکوۃ وصدقات، صلہ رحم وتعلیم وتربیت، میرے خیال میں ہر مسلمان کو اپنی زندگی میں اس فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہیے، یہ ترتیب معتدل ومتوسط حالات کے لیے ہے، غیر معمولی حالات میں اس میں تغیر کرنا ہوگا، مثلاً جس وقت صنف دوم یا سوم کی عبادات زیادہ ضروری ہوجائیں تو صنف اول کی عبادات میں اتنا تغیر کرنا ہوگا کہ ان میں سے فرائض وسنن ادا کرنے کے بعد جو وقت بچے وہ صنف دوم یا سوم میں صرف کیا جائے، لیکن صنف اول کا وہ حصہ جو صنف دوم یا سوم کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے مثلاً ذکر قلب وتلاوت، وہ کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے، دوسرے یہ کہ کسی خاص صنف کے زیادہ ضروری ہونے کی حالت میں تمام اعمال میں خواہ وہ دنیاوی ہوں یا دینی اسے پیش نظر رکھنا چاہیے، اوران کا انتخاب اس طرح کرنا چاہیے کہ حتی الامکان تمام اعمال کم از کم ضمناً ہی اس صنف کی عبادت کے لیے معین ہوں۔

تذکیر وتعلیم ہمیشہ سے ضروری رہی ہے اور جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد زمانی بڑھتا گیا ہے اسی قدر زیادہ ضروری ہوتی گئی ہے، لیکن یہ اصول کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہی تذکیر مفید ہوسکتی ہے جس کی جانب مخاطب کا نفس متوجہ کیا جاسکے، عوام بلکہ خواص کے نفوس بھی امور حاضرہ دنیاوی کی جانب آسانی سے متوجہ ہوجاتے ہیں کہ یہ تقاضائے فطرت ہے، اس لیے حکمت الٰہی اس کی مقتضی ہوئی کہ اس امت کے لیے جس کو بفحوائے ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ ہدایت کا کام سپرد کیا گیا تھا، غلبہ وتفوق فی الارض وعلو بھی لازم کردیا گیا نہ اس لیے کہ "إکراہ فی الدین" ہو بلکہ اس لیے کہ نفوس امم اس امت کی تقلید پر آمادہ ہوجائیں اوران کی تذکیر پر توجہ کریں، کیونکہ اہل دنیا جن کے نزدیک دنیا ہی سب سے بڑی چیز ہے کسی کا دنیاوی غلبہ دیکھ کر اسے ہر امر

میں اپنے سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے مذہبی اور ذہنی تفوق پر بھی ایمان لے آتے ہیں، انبیائے سابقین میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے سبا کے قاصدوں کو دکھانے کے لیے اپنی عظمت اسی لیے ظاہر کی تھی اور ملکہ سبا کا تخت منگوالینا بھی اسی پر مبنی تھا نیز اسی طرح مُمرَّد میں لے جانا بھی اسی غرض سے تھا کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی حیثیت سے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے کمتر سمجھے اور جس طرح اس نے کانچ کو پانی سمجھنے میں غلطی کی اور اس غلطی کا احساس کیا، اسی طرح اپنی آفتاب پرستی کی غلطی کا بھی احساس کرے، چنانچہ اس غلطی کے احساس کے بعد اسے اس غلطی کا بھی احساس ہو گیا اور وہ ایمان لے آئی، معجزات کا بہت بڑا فائدہ بھی یہی تھا کہ ان کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی عظمت نمایاں ہو جاتی تھی اور قوم کے نفوس ان کے کلام پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

اس زمانہ کے حالات دیکھتے ہوئے یہ اظہر من الشمس ہے کہ صنف دوم کی عبادات کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور ان میں بھی بحکم ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ استعداد کی اہمیت سب سے زائد بڑھ گئی ہے، اس وقت کے حالات اس کے مقتضی ہوئے ہیں کہ قتال کی فرضیت استعداد کی طرف منتقل ہو جائے، اس لیے مسلمانوں کے تمام اعمال میں یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیے اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق اپنے تمام اعمال میں خواہ وہ معاش کے لیے ہوں یا معاد کے لیے، اس کی اعانت کرتے رہنا چاہیے، مطلق علم ایک صفت مستحسن ہے، اسی طرح تمام علوم طبع سلیم کو مرغوب ہیں لیکن ان میں سے بعض عملی حیثیت سے انسان کی جسمانی و مادّی ترقی کے لیے ضروری ہیں، اور بعض روحانی ترقی و تزکیۂ باطن کے لیے اور بعض تنشیط ذہن اور تفریح طبع کے لیے۔

تحصیل علوم کے احکام نیت پر موقوف ہیں، لیکن جو علوم تزکیۂ باطن کے لیے ضروری ہیں مثلاً علوم قرآن و حدیث و سیرت، ان سے بہرحال شغل رکھنا ضروری

ہے، جن حالات میں استعداد کی اہمیت بڑھ جائے گی، انھیں حالات میں ان علوم کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی جن پر استعداد موقوف ہے، مثلاً کیمیا وریاضی وطبعیات والسنہ وتاریخ واقتصاد وصناعات وغیرہ۔

استعداد فرض کفایہ ہے اس لیے ان علوم کی تحصیل بھی فرض کفایہ ہو جائے گی، اور جب تک ان علوم کے ماہرین کی تعداد کفایت کی حد تک نہ پہنچ جائے تمام افراد پر اس کا بار رہے گا۔

تیسری قسم کے علوم مثلاً ادب وشعر بھی بعض وقت موکد ہو جاتے ہیں اور بعض وقت مکروہ، جب باعث اضاعت وقت ہو جائیں تو مکروہ ہو جائیں گے، اور جب ان سے فرائض ومؤکدات کے لیے ذہن کو تیار کرنے کا کام لیا جائے تو مؤکد ہو جائیں گے۔

میں اپنے لیے جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ انھیں اصول پر مبنی ہے، سب سے پہلے میں تزکیہ نفس واحسان کو ضروری سمجھتا ہوں، اس کے لیے میری یہ خواہش ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب (۱) سے بیعت کروں، اور حسب ضرورت ان کی خدمت میں رہوں، اب میں ان کی واپسی کا منتظر ہوں، لیکن معلوم نہیں کہ کل کیا ہو، اس لیے اس کے متعلق میں جناب سے مشورہ چاہتا ہوں، میری ذاتی خواہش ان کے بعد مولانا محمد علی صاحب (۲) سے ہے، لیکن مولانا محمود حسن صاحب کے علاوہ اور کسی بزرگ سے میں اسی وقت بیعت کروں گا جب کچھ روز صحبت میں رہ کر مجھے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ (۳)

---

(۱) حضرت شیخ الہندؒ جو استاد بھی تھے، اور اس وقت مالٹا میں اسیر تھے۔ (ع) ۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں دیوبند میں انتقال فرمایا۔ (م)

(۲) حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، بانیٔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ (ع)

(۳) بالآخر ڈاکٹر صاحب جانشین شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بیعت ہوئے اور اس وقت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ بھی انتقال فرما چکے تھے۔ (م)

معاش کے لیے فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ تحصیل معاش میں وقت کم صرف ہو اور حتی الامکان شدید دماغی محنت نہ برداشت کرنی پڑے تاکہ میں اپنا دماغ اس سے بہتر کاموں میں لگا سکوں، اور بہتر تو یہ ہے کہ کسی خاص مقام یا شخص یا حکومت کا مجھے پابند نہ ہونا پڑے، ڈاکٹری میں حسب ذیل وجوہ سے پسند نہیں کرتا:

۱۔ اگر برابر پاس ہوتا جاؤں تو پانچ برس مجھے ابتدا کرنے کے لیے چاہئیں۔

۲۔ بہترین قوائے دماغی اس کی تحصیل میں ضائع ہو جائیں گے۔

۳۔ مطب کی کامیابی کی صورت میں اگر ایمانداری سے کام کروں تو نہ وقت بچے گا نہ دماغ۔

جناب نے محکمۂ تعلیم کی ملازمت کی جانب اشارہ فرمایا ہے لیکن ٹریننگ کالج کی مدت تعلیم چھ مہینے نہیں بلکہ دو سال ہے، اس کے بعد بھی پروفیسری کی اہلیت نہیں پیدا ہوسکتی، وہ تو ایم. ایس. سی. پاس کرنے کے بعد صرف کثرت مطالعہ پر موقوف ہے، اگر محض خدمت علم مدنظر ہوتی تو میں اپنی تمام عمر اس میں صرف کرتا اور مجھے امید تھی کہ نئے نتائج حاصل کرتا، مگر مقصود دین ہے، اس لیے اس علم پر جو دین کا وسیلہ نہ ہو قناعت نہیں کی جاسکتی، اگر ٹریننگ کالج میں ایل. ٹی. پاس کروں تو ہیڈ ماسٹر ہوسکتا ہوں لیکن یہاں بھی مجھے مدرسہ کے علاوہ وقت صرف کرنا ہوگا، اس کے علاوہ دنیاوی حیثیت سے بھی یہ دونوں جگہیں زیادہ مفید نہیں، یعنی اس صوبہ میں دو گورنمنٹ کالج ہیں، ایک الٰہ آباد میں دوسرا بنارس میں، اور وہاں مجھے پروفیسری کی کوئی امید نہیں، اس لیے کہ وہاں انگریز ہی پروفیسر ہوتے ہیں یا ایسے ہندوستانی جو جرمنی وغیرہ کے تعلیم یافتہ ہوں، اس لیے مجھے اسسٹنٹ پروفیسری کی امید ہوسکتی تھی، مگر دستور یہ ہے کہ حتی الامکان وہ انگریز پروفیسر اپنے شاگردوں ہی کا انتخاب کیا کرتے ہیں اور

کالجوں یا اسکولوں میں ملازمت کروں تو تھوڑی تنخواہ پر بہترین وقت وعمر ودماغ صرف کرنے کے بعد بھی پنشن نہیں مل سکتی، محکمۂ تعلیم کے علاوہ اور کسی صیغہ میں مستقل طور سے ملازمت کرنے پر طبیعت راغب نہیں ہے۔

میرے خیال میں تیسری صورت سب سے بہتر ہے یعنی میں مطب کروں (۱) لیکن اسی پر اقتصار کر لینا بہتر نہیں معلوم ہوتا، خدائے تعالیٰ سے بہر حال امیدیں ہیں، لیکن توکل فعل قلب ہے نہ کہ فعل جوارح، اگر تزکیہ باطن سے توکل حاصل ہو جائے تو اور پیشے اس میں مضر نہیں ہو سکتے، اگر نہ حاصل ہو تو اور اعمال کے ترک سے توکل پیدا نہیں ہو سکتا، اس لیے میں مطب کے ساتھ ہی دوسرا شغل بھی رکھنا چاہتا ہوں، یعنی ہندوستانی دواخانہ کی طرز کی دوکان اور انگریزی دواسازی یا صابون سازی کا کارخانہ، اس میں غالباً جناب خیال فرمائیں کہ وقت زیادہ صرف ہوگا لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے، اگر صحیح طریقہ پر کام کیا جائے تو محض نگرانی سے سب کام چل سکتے ہیں، ابتدا میں جس وقت کام چھوٹے پیمانہ پر ہوگا تو مجھے بحیثیت صناع کیمیائی کے بعض جزئیات کی براہ راست نگرانی کرنی ہوگی، اور اس کے بعد جب میں معمولی درجہ کے کیمیادانوں کو مقرر کر سکوں گا تو میں مشیر کیمیائی کی حیثیت سے ان کے کام پر نظر رکھوں گا اور محض تجارتی نگرانی ضروری ہوگی، عملی تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، کانپور میں گورنمنٹ سوڈا فیکٹری کا انتظام مسٹر شری واستوا (۲) کے سپرد تھا اور وہ کارخانہ اپنی طرز کا پہلا کارخانہ ہے، کیونکہ اس طریقہ سے سوڈا بنانا خود شری واستوا نے دریافت کیا ہے، باوجود اس کے شری واستوا کو اس کارخانہ میں جانے کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی، اور اس سے وہ اتنا وقت بچا سکتے تھے کہ ایک صنعتی مدرسہ میں پرنسپل اور محکمۂ صنعت وحرفت میں اسسٹنٹ ڈائرکٹری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، اور اس کے

---

(۱) بھائی صاحب طب یونانی کے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ (ع)

(۲) جے۔ پی شری واستوا جو بعد میں یوپی کے منسٹر بھی ہوئے۔ (ع)

بعد بھی بالکل عدیم الفرصت نہ تھے، اس کارخانہ کے متعلق تو میرا عینی تجربہ ہے، دوسرے کارخانوں کے متعلق بھی میں نے ایسا ہی سنا ہے، مثلاً کانپور کا دواسازی کا کارخانہ، جس میں اس کا منیجر زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے روزانہ صرف کرتا ہے۔

یہ صورت میں اس لیے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ تحصیل زر سے کم از کم میری یہ نیت نہیں ہے کہ محض ذاتی آسائش حاصل کروں اور مجھے خدا تعالیٰ پر بھروسہ ہے کہ اپنی نیت پر عمل کرنے کی مجھے توفیق دے گا، میں تحصیل زر کو صنف دوم کی عبادات میں سے سمجھتا ہوں جو اس وقت بہت اہم ہو گئی ہیں، نیز خود ذریعہ تحصیل اس سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ ایمان واخلاق کے بعد صناعات جدیدہ ہی موجب قوت ہیں اور ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ پر عمل ان صناعات کو کچھ مسلمانوں میں رائج کرنے ہی سے ممکن ہے اور دواسازی پر سیاست حربی کا بڑا حصہ مبنی ہے، میں نے اس کے متعلق شری جے. پی. واستوا سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ کہا کہ انگریزی دوا سازی اور صابون سازی سب سے زیادہ ضروری اور مالی حیثیت سے بہت امید افزا ہیں، اور چیزوں کے متعلق میں نے دریافت کیا تو انھوں نے بہت سی صنعتوں کے نقائص بتائے اور بعض کے متعلق کہا کہ ابھی زیر تجربہ ہیں، دواسازی اور صابون سازی کے کام کرنے کا انھوں نے یہ طریقہ بتایا کہ پہلے بنگلور کے سائنس انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً ایک سال تک اس کا عملی تجربہ حاصل کرنا چاہیئے اس کے بعد کسی کارخانہ میں ملازمت کر لینا چاہیئے جو بہت آسانی سے ممکن ہے، وہاں کارخانہ چلانے کا اور تجارت ونرخ کی کمی بیشی اور بازاروں کا عملی تجربہ ہو جائے گا، جب اپنے اوپر اعتماد ہو جائے تو خود کام شروع کر دینا چاہیئے، اس وقت روپیہ ملنا کچھ دشوار نہیں ہے، ایسی حالت میں لوگ اپنی خواہش سے سرمایہ دیں گے، انھوں نے یہ کہا کہ ہمیشہ بنیاد مضبوط رکھنی چاہیئے اور بغیر دوسرے کارخانہ میں تجارتی تجربہ حاصل کیے ہرگز کام نہ شروع کرنا

چاہئے، بنگلور انسٹی ٹیوٹ میں کام سیکھنے کی یہ صورت بتائی کہ گورنمنٹ صوبجات ونظام وغیرہ کی جانب سے وظائف دیئے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی وظیفہ حاصل کر لینا چاہئے، گورنمنٹ کا وظیفہ حاصل کرنے کی یہ صورت ہے کہ میرے لیے کیننگ کالج اور لکھنو کے ڈپٹی کمشنر تحریک کریں، وہ تحریک کانپور کے بورڈ صنعت وحرفت میں پیش کی جائے گی، اس بورڈ کا تعلق شری واستوا سے بھی ہے، اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اور ڈاکٹر ولی محمد صاحب بھی اس کے ممبر ہیں، مسٹر شری واستوا نے امید دلائی کہ یہاں اس تحریک کے پاس کرانے میں مدد دیں گے، اس کے بعد گورنمنٹ ممالک متحدہ اسے منظور کر لے گی، اور پچھتر روپئے ماہوار وظیفہ ملے گا۔

اس رائے کے سننے کے بعد میں نے یہ خیال کیا کہ وظیفہ حاصل کر کے بنگلور میں ایک سال رہوں اور اس عملی تعلیم کے دوران میں طبی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کروں، اس کے بعد اگر دہلی کے کسی کارخانہ میں ملازمت ہو جائے تو حکیم اجمل خاں صاحب کے یہاں مطب بھی کرتا رہوں، اور اگر بمبئی و کانپور وغیرہ میں ملازمت ہو تو خود مطب کروں، اور ملازمت چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں مطب کے ساتھ کام شروع کروں اور اگر مناسب ہو تو لکھنؤ میں مطب شروع کرنے سے پہلے طبیہ کالج دہلی میں ایک سال کے لیے کیمیا، علم النباتات یا علم الحیوانات پڑھانے کے لیے ملازمت کر لوں، اور اسی کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب کے مطب سے استفادہ کرتا رہوں، شری واستوا نے یہ بھی کہا کہ انگریزی دواسازی حاصل کرنے کے بعد میں طب کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہوں، میرے خیال میں یہ قرین قیاس بھی ہے، ایک سال ہوا، میں نے اس خیال سے کہ زہرمہرہ اصلی بہت مشکل سے ملتا ہے، اس کا کیمیائی تجزیہ کیا تھا تا کہ مصنوعی زہرمہرہ بنا سکوں جو نفع میں اصلی کے برابر اور قیمت میں بالکل سستا ہو، چار اجزاء تک دریافت کر سکا تھا اس کے بعد موقع نہیں ملا کہ اس کی تکمیل کرتا، انگریزی

دواسازی بھی اگر مطب کے ساتھ کرتا رہا تو اس قسم کے کام بھی کر سکوں گا۔(۱)

وظیفہ حاصل کرنے میں بظاہر کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی، مجھے امید ہے کہ اگر میں کیننگ کالج کے پرنسپل سے کہوں گا تو وہ خود بھی تحریک کریں گے اور ڈپٹی کمشنر سے بھی کہہ دیں گے، مگر وہ آجکل منصوری میں ہیں اور چھ ماہ کے لیے ولایت (۲) جانے والے ہیں، اس لیے اگر وظیفہ ہی کے لیے کوشش کرنا ہو تو مجھے ان سے مل لینا چاہیئے، یا خط لکھ دینا چاہیئے، اس وقت جو فیصلہ کیا جائے گا وہ دنیاوی واخروی دونوں زندگیوں پر ابد تک کے لیے مؤثر ہوگا، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے، اس لیے جناب سے گذارش ہے کہ میں نے جو اصول عرض کیے ہیں اور کام کا جو نظام قائم کیا ہے اس میں جو سقم ہوں اس سے جناب مطلع فرمائیں، اب تک میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ جناب کے حسب ارشاد عمل کرنے میں میں نے فلاح پائی ہے، اس لیے آئندہ بھی اسی تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں، میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس کے اختیار کرنے کے لیے جناب ارشاد نہ فرمائیں اور اس پر میرا

---

(۱) بالآخر ڈاکٹر صاحب نے مطب شروع کیا اور تینوں طریقہ علاج (یونانی، ایلوپیتھ اور ہومیوپیتھ) سے مریض کے حسب حال دوا تجویز کرتے، ساتھ میں ان کے اندر دواسازی کا فکرہ بڑھتا رہا، اور ان پیچیدہ بلکہ مہلک امراض کے علاج کی پہلے فکر کی جس کا علاج تینوں طریقہ علاج میں دشوار ہو رہا تھا، اور اس کے لیے کوئی ایک دوا متعین نہیں تھی، "شربت کبد" کے نام سے پتہ کی پتھری کے علاج کے لیے سیرپ تیار کیا جو اس کے ساتھ جگر اور پیٹ کے دیگر امراض کے لیے بھی بڑا ہی کارگر ہوا، اور "کبد ون" کے نام سے آج بھی ان کے دواساز ادارے "حسنی فارمیسی" سے بن رہا، گردہ کی پتھری اور اس کے امراض کے لیے "شربت درد گردہ" کے نام سے سیرپ تیار کیا جو اب "ہردینا" کے نام سے تیار ہو رہا ہے، جذام کے لاعلاج مرض کا علاج بھی ڈھونڈ نکالا، اور "شربت جذام" کے نام سے سیرپ تیار کیا، اور یہ اطمینان حاصل کیا کہ اس کا فائدہ خدا کے شکر سے ۹۰ اور ۱۰۰ فیصدی کے درمیان رہا ہے، جو "جذامین" کے نام سے حسنی فارمیسی لکھنؤ سے تیار ہو رہا ہے، اور مسلسل حیرت انگیز نتائج سامنے آتے رہتے ہیں، ذیابیطس کے مریضوں کے لیے کامیاب دوا "سفوف ذیابیطس" کے نام سے تیار کی، جو اب "نشکر" کے نام سے گولیوں کی شکل میں منظر عام پر ہے، اور مریض اگر پرہیز سے کام لے تو بڑی ہی مؤثر ہے، اسی طرح حد سے زیادہ کمزوری رفع کرنے کے لیے "شربت اکسیر قوت" تیار کیا۔ (م)

(۲) لندن برطانیہ کے لیے اس لفظ کا استعمال خصوصیت سے اس لیے تھا کہ حکومت ہند اسی کے زیر تسلط تھی۔ (م)

قلب مطمئن نہ ہو جائے۔

وعلی اللّٰہ توکلنا وھو یھدی السبیل وھو حسبنا ونعم الوکیل.

کمترین عبد العلی

۵؍رمضان　　　　از: ہنسوہ

۲- مولانا المحترم (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سو روپیہ کا ایک نوٹ روانہ خدمت کرتا ہوں، رسید سے مطلع فرمائیے گا، پانچ روپیہ کا نوٹ علی سلمہ کو دے دیجئے، علی سلمہ پہنچ گئے ہیں، امید ہے کہ ان کا یہ سفر محض تفریح سے کچھ بڑھ کر ثابت ہوگا، اور آپ ان کی اخلاقی تربیت سے غافل نہ رہیں گے، لاہور کی علمی خصوصیتیں توجہ دلانے کے قابل ہیں، معاہد علمی کے علاوہ ممتاز شخصیتوں کے فیض صحبت سے جو کچھ مل جائے، اس کے حصول سے غفلت نہ کرنا چاہیے، میوزیم کی سیر دلچسپ اور سبق آموز ہوگی، مولانا احمد علی (شیر انوالہ گیٹ) کی صحبت کو غنیمت سمجھیں (۲)، اس سب سے ضروری آپ کی صحبت سے استفادہ ہے، ان پر یہ نقش کر دیجئے کہ موجودہ تمدن کی آب وتاب سطحی اور کھوکھلی ہے، اور ہمارے آباء کرام کا طریقہ ہمارے لیے ہمیشہ

---

(۱) یہ خط پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب ایم.اے. کے نام ہے، جو اس وقت اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور یہ ناچیز ۱۹۲۹ء میں جبکہ ۱۶؍سال کی عمر تھی پہلی مرتبہ لاہور گیا تھا۔ (ع) اچھی عمر پائی، تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے ان سے خصوصی استفادہ کیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: پرانے چراغ حصہ دوم، از مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ (م)

(۲) حضرت مولانا احمد علی لاہوری (م ۱۹۶۲ء) حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے استاد اور شیخ اول ہیں، سلسلۂ قادریہ راشدیہ سے قوی النسبت اور عالی مرتبت شیخ اور صاحب کشف وکرامات بزرگ ہونے کے ساتھ مجاہد فی سبیل اللہ اور اولوالعزم داعی تھے، قرآن مجید کا ترجمہ کیا، درس قرآن بڑا معروف ہوا، حجۃ اللہ البالغہ کا بھی اہتمام سے درس دیتے تھے، ان دروس سے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے استفادہ کیا، اور ارادت واسترشاد کا تعلق قائم کر کے ان کا مزید تعلق حاصل کیا، اور بعد میں خلیفہ بھی ہوئے۔ (م)

قابل تقلید رہے گا، خواہ ہم کتنی ہی علمی واقتصادی ترقی نہ کرلیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اسلاف ذاتی کمالات (نہ کہ اضافی) سیرت اور تقویٰ میں ایسے تھے جن کی نظیر اللہ تعالیٰ نے نہیں پیدا کی، ہماری بدنصیبی ہوگی اگر ہم ان سے بے خبر رہیں اور ان کے اتباع سے محروم رہ جائیں، ان کو بتا دیجئے کہ ان کی عملی زندگی ہمارے منتہائے تخیل سے بھی بدرجہا بلند تھی، ہمارا مطمح نظر ابھی اس سے بدرجہا پست ہے، آدمیت علم و دولت و تہذیب سے بہت اونچی چیز ہے، اچھی پھوا سے سلام کہہ دیجئے۔

۲۱ر مئی ۱۹۲۹ء　　　　　　　　عبد العلی

۴۳-　　برادر عزیز از جان سلمکم اللہ (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم لوگ بفضلہٖ تعالیٰ اچھے ہیں، اچھی پھوا (۲) کے خط سے معلوم ہوا کہ تم ان کے یہاں نہیں ہو، جہاں مناسب ہو رہو، مگر کھانے کا انتظام اپنا ہو، (یہ مقصود نہیں کہ اچھی پھوا کے یہاں بھی اپنا انتظام ہو) مولانا (۳) سے روپیہ لیتے رہو اور کھانے کے مصارف ادا کرتے رہو، جتنے دن ضرورت سمجھو رہو اور جب آنے لگو تو خانپور (۴) اور

---

(۱) یہ خط لاہور لکھا گیا تھا، سن غالباً ۳۱/۳۲ ہے، مکتوب الیہ اس وقت مولانا احمد علی صاحب کے پاس مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتا تھا۔ (ع)

(۲) پھوپھی صاحبہ مرحومہ اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحب۔ (ع)

(۳) مولانا سید طلحہ حسنی صاحب۔ (ع)

(۴) خانپور کے قریب دین پور ایک بستی ہے، وہاں مولانا احمد علی صاحب مدظلہ کے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب تشریف رکھتے تھے، میری پہلی بیعت حضرت ہی سے تھی۔ (ع)

حضرت خلیفہ صاحب نے اپنے باکمال مسترشد وخلیفہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ (متوفی ۱۹۶۲ء لاہور) کی تربیت میں دیا، جن سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۶ء میں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت خلیفہ صاحب ایک مرجع خلائق بزرگ تھے، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو بھی ان سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ (م)

تھانہ بھون ہوتے ہوئے آؤ، تھانہ بھون میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مقیم ہیں، ان کے یہاں ٹھہر سکتے ہو، تم سے اگر ملاقات نہ ہو تو میرا نام بتا دینا، میں انھیں خط بھی لکھ دوں گا، جانے سے پیشتر مولانا اشرف علی صاحب کو خط کے ساتھ جوابی لفافہ بھیج دو اور اس میں اپنا مختصر تعارف اس طرح کرا دو کہ فلاں کا بیٹا ہوں، اتنی تعلیم حاصل کی ہے اور فلاں سے بیعت کی ہے، اور مقصد آمد محض شرف ملاقات و زیارت ہے، اور اتنے دن تقریباً قیام رہے گا، جب مولانا کا جواب آجائے تو اپنے ساتھ یہ جواب لیتے جانا اور پہنچنے پر جواب دکھلا دینا۔

اگر وہاں رہنا مفید معلوم ہو تو کچھ دن ٹھیر جانا، گھر کی ضرورتوں کے خیال سے آنے میں جلدی نہ کرنا، غالباً جتنے دن وہاں رہو کچھ فوائد ہی پہونچتے رہیں، لا یشقیٰ جلیسُهم.

مولوی مسعود علی صاحب(۱) کے جانے کے بعد میں نے پھر طلبہ میں کسی قسم کی تحریک محسوس نہیں کی، گویا وہ کبھی آئے ہی نہ تھے، اب پھر آنے والے ہیں۔

عطیہ(۲) گوپامئو میں ہیں، اپنی خوشی سے گئے ہیں، بطور مہمان کے مقیم ہیں، ان کے میزبان کہتے تھے کہ جب تک رہنا چاہیں گے رہیں گے۔

محمود و محمد ثانی (۳) کی تعلیم کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہے، میرے خیال میں لکھنؤ میں رہنا چاہیئے اور دار العلوم میں داخل ہونا چاہیئے، محمد عربی(۴) سے فائدہ

---

(۱) مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے کچھ روز مسجد کی تعمیر کے زمانہ میں دار العلوم میں قیام فرمایا تھا، اس سے طلبہ میں خاصی تحریک اور دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ (ع)

(۲) ایک عرب نوجوان مدینہ طیبہ کے رہنے والے، اس وقت دار العلوم میں مقیم تھے۔ (ع)

(۳) ہمارے بھانجے۔ (ع) ان دونوں بھانجوں نے مکتوب الیہ کی حیات میں ہی وفات پائی، بڑے بھانجہ نے ۱۹۴۲ء میں ۲۱ رسال کی عمر میں یعنی مکتوب نگار کے بھی سامنے اور مولانا سید محمد ثانی حسنی (ندوی مظاہری) نے ۱۹۸۲ء میں ۵۷ رسال کی عمر میں وفات پائی، غفر الله لهما ورحمهما الله رحمة واسعة. (م)

(۴) ہمارے استاد شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی کے چھوٹے بھائی جو اس وقت دار العلوم میں مدرس تھے۔ (ع)

پہنچے گا، محمود اردو، حساب اور دینیات پڑھ سکتے ہیں درجۂ ابتدائی میں۔

اشتہارات(۱) آنے پر تقسیم کرادیئے جائیں گے۔

۱۶/اپریل　　　　عبدالعلی

۴- برادر عزیز سلمکم اللہ تعالیٰ(۲)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے متعدد خطوط پہنچے، مگر جواب دینے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، اس سے تمہیں بہت تشویش ہوئی ہوگی، ہم لوگ بفضلہٖ تعالیٰ اچھے ہیں، تمہارے جانے کے بعد ایک بار خدیجہ(۳) کو بخار آیا تھا اور ایک بار اسہال کی شکایت ہوئی تھی، اب بحمد اللہ کوئی شکایت نہیں ہے۔

اس سے بہت خوشی ہوئی کہ تمہاری صحت اچھی ہے، اور بھوک اور ہضم کی قوت بڑھ گئی ہے۔

جن کپڑوں کی ضرورت تم محسوس کرتے ہو بھیج دیئے جائیں گے، جلد مطلع کرو، جب سے باورچی خانہ میں کھانا کھانے لگے ہو، اس وقت سے ناشتہ کا کیا انتظام ہے، اگر کوئی انتظام نہ ہو تو بازار سے پکا ہوا دودھ اور بسکٹ لے کر کھالیا کرو۔

غالبًا قیام مولانا(۴) کے یہاں ہوگا، اس سے بھی مطلع کرو۔

---

(۱) یاد نہیں کس قسم کے اشتہارات مراد ہیں۔ (ع)

(۲) یہ خط اس وقت لکھا گیا جب مکتوب الیہ دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھا، اور مولانا مدنیؒ کے درس حدیث میں شرکت کرتا تھا۔ (ع)

(۳) ڈاکٹر صاحبؒ کی تیسری صاحبزادی جو بعد حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی اہلیہ ہوئیں، مرتب کی نانی اور مولانا سید محمد حمزہ حسنی (ناظر عام ندوۃ العلماء) کی والدہ ماجدہ ہیں، ۳۰/اگست ۱۹۹۹ء کو رائے بریلی میں انتقال کیا، ان کے عم محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (م)

(۴) مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ (ع)

مولانا انور شاہ صاحب (۱) ہیں یا گئے، اگر ہوں تو ان سے بھی استفادہ کا موقع ملتا ہے یا نہیں؟ (۲)

اپنے چوبیس گھنٹے کے پروگرام سے مطلع کرو اور لکھو کہ جمعرات و جمعہ کو سبق ہوتا ہے یا نہیں اور ان ایام کے علاوہ بھی کسی مسئلہ پر گفتگو کا موقع ملتا ہے یا نہیں؟ یہ بھی لکھو کہ حضرت مولانا کی خدمت میں رہنے کا کتنا موقع ملتا ہے؟

جہاں رہتے ہو وہاں کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں اور وہ کس قسم کے لوگ ہیں؟

جب تم وہاں گئے تھے اس وقت سے اب تک اپنے میں کوئی تغیر محسوس کرتے ہو یا نہیں؟ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مفصل جواب لکھنا اور میرے خط کو سامنے رکھ کر لکھنا تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے۔

حضرت مولانا کی خدمت میں سلام عرض کر دینا۔ (۳)

عبدالعلی

لکھنؤ ۲۷ر ستمبر ۱۹۳۲ء

(۱) علامہ انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم دیوبند کے سرمایۂ افتخار استاد حدیث اور اپنے عہد کی مایہ ناز علمی شخصیت رہے، مکتوب نگار کے استاد حدیث ہیں، جب وہ دیوبند تعلیم حاصل کرنے گئے تھے، مکتوب الیہ جب استفادہ کے لیے دیوبند میں مقیم تھے، اس زمانہ میں علامہ کشمیریؒ اپنی علالت کی وجہ سے ڈابھیل سے دیوبند آئے ہوئے تھے، بعض ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے دیوبند سے ڈابھیل درس وافادہ کے لیے چلے گئے تھے، وہیں ان کے ساتھ ان کے ممتاز شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانی اور علامہ سید یوسف بنوری بھی تھے، حضرت علامہ کشمیری کی دیوبند تشریف آوری کو غنیمت جان کر مکتوب الیہ نے زیارت وملاقات کی۔ (م)

(۲) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے استفادہ کا موقع حاصل کیا، ان کے الفاظ ہیں: ''اسی زمانہ قیام دیوبند میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری ایک مرتبہ ڈابھیل سے تشریف لائے اور اپنے دولت خانہ (محلہ خانقاہ) میں قیام فرمایا، بھائی صاحب نے ہدایت کی تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں، اور ان کا سلام پہنچاؤں، میں نے سلام پہنچایا تو انھوں نے پہچان لیا، اور خیریت وحالات دریافت کئے، غالباً دو تین بار ان کی عصر کی مجلس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔'' (کاروان زندگی حصہ اول ص/۱۳۲)

(۳) یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء، دیوبند، سہارنپور) شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، جن سے خصوصی استفادہ کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے دیوبند میں قیام فرمایا تھا۔ (م)

۵- جناب خالہ صاحبہ دام مجدہا(۱)

سلام مسنون کے بعد گذارش ہے کہ ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں، امید ہے کہ آپ لوگ بھی بخیر وعافیت ہوں گی۔

علی سلمہ بدستور تبلیغ دین کا کام کر رہے ہیں، اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی کام نہیں، اس لیے کہ انبیاء اسی کام کے لیے مبعوث کئے گئے تھے، میری تمنا تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے، مگر معاش کی مجبوریاں مانع ہیں۔

تعلیم کا کام بھی انھیں کرنا پڑتا ہے، اس لیے انھیں بہت محنت کرنا پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے، اور ان کی صحت اور قوت میں برکت عطا فرمائے، اور اپنے دین کی خدمت عرصۂ دراز تک لیتا رہے۔

زراعت وباغبانی کا جو کچھ کام میں کر رہا ہوں (۲) اس کی غرض یہ تھی کہ ہم دونوں مل کر اعلاء کلمۃ اللہ میں اپنا وقت صرف کرسکیں، اور نہ انھیں ملازمت کی حاجت رہے اور نہ مجھے مطب کی پابندی رہے، تعلیم دین بھی ثواب کا کام ہے مگر ملازمت کی پابندی سے مقصد میں خلل ہوتا ہے، ملازمت نہ ہوتی تب بھی وہ انشاء اللہ قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے اور تبلیغ کا کام بھی کرتے اور میں بھی کرتا، دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اپنی رضامندی کی راہ پر چلاتا رہے، اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر قائم رکھے اور اپنے دین کی خدمت لے اور ہمارے ذریعہ سے گمراہوں کو سیدھی راہ دکھائے اور اس طرح رزق عطا فرمائے کہ سوائے اللہ کے کسی کی حاجت نہ رہے۔

جس طرح علی سلمہ کام کر رہے ہیں اس سے میرا دل بالکل مطمئن ہے،

---

(۱) یہ خط والدہ صاحبہ مدظلہا کے نام ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت سے واپس آکر لکھنؤ میں تبلیغی کام شروع کیا تھا جو بھائی صاحبؒ کے خاص ذوق اور دلچسپی کی چیز تھی، اور مدت سے ان کی آرزو تھی کہ میں اس کام میں مشغول ہوں، اس وقت میں دار العلوم میں تدریس کا کام بھی کرتا تھا۔ (ع)

(۲) بھائی صاحبؒ وطن میں کچھ باغ لگا رہے تھے تاکہ معاش سے فارغ ہوسکیں۔ (ع)

عرصہ سے جس بات کی تمنا تھی وہ حاصل ہو رہی ہے، دل کو قرار ہو گیا اور آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں، مگر شوق اس کا طالب ہے کہ اور ترقی ہو اور جس طرح سید صاحبؒ (۱) سے اسلام کو ترقی ہوئی ویسے ہی علی سلمہ کی کوششوں سے ترقی ہو اور مجھے بھی کام میں شرکت کا موقع ملے، دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ یہ تمنا پوری فرمائے، اور ہم لوگوں کی صحت وقوت میں ایسی برکت عطا فرمائے کہ یہ کام پورا ہو۔

اجو و محمود سلمہما سے دعا فرما دیجئے۔ (۲)

۲۰/ مارچ ۱۹۴۰ء عبد العلی

۶- برادر عزیز از جان سلمکم اللہ تعالیٰ (۳)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خطوط سے خیریت معلوم ہوتی رہی، دل کو بڑا اطمینان رہا، وہاں کے حالات سے بھی بڑی خوشی رہی، آخری خط سے حضرت سید صاحبؒ کے عہد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا، دل کی عجیب کیفیت رہی، سید صاحبؒ کے تذکرے سے قلب میں جو رقت اور نور پیدا ہوتا ہے وہ تو تھا ہی، اسی کے ساتھ اس زمانہ کے

---

(۱) امیر المؤمنین سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ (شہید بالاکوٹ ۲۴/ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ)

(۲) سیدہ امۃ العزیز صاحبہ (م. ۲۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ) بھائی بہنوں میں حضرت ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ کے بعد سب سے بڑی، خاندان اور گھر کے بڑے ان کو محبت و پیار میں اجو کہتے تھے، حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی مدظلہما کی والدہ ماجدہ ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مہاجر مدنیؒ سے اصلاح واستفادہ کے سلسلہ میں مراسلت رکھی اور ان کی بڑی دعائیں حاصل کیں، ان ہی سے بیعت تھیں، ان کے بڑے بیٹے سید محمود حسن ۱۹۴۲ء میں وفات پاگئے، جس کا مکتوب میں ذکر ہے، ان کا بھی نام محمد تھا، محمود حسن نام ان کے نانا مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی نے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے نام پر رکھا تھا، رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (م)

(۳) یہ خط اس وقت کا ہے جب مکتوب الیہ صوبہ سرحد کے دورہ اور پنجتار کے سفر سے (جو کئی سال تک حضرت سید احمد شہیدؒ کا مستقر رہا ہے) واپس لاہور آیا تھا، اور بھائی صاحب کو پنجتار کا حال لکھ چکا تھا۔ (ع)

اندوہناک واقعات اور مسلمانوں کی بدقسمتی نے دل کو ایسا پژمردہ کردیا کہ اب تک اثر باقی ہے، فتح خاں (۱) کے اعقاب کا حال سن کر بے اختیار دل چاہا کہ میں بھی وہاں ہوتا، جی چاہتا ہے کہ انھیں کوئی ہدیہ بھیجتا، طول مسافت اگر اس سے مانع ہے تو کم از کم جی چاہتا ہے کہ میرا اسلام پہنچ جائے۔

خادی خاں (۲) نے جو کیا اس سے ہم لوگوں کا دل ٹکڑے ہوتا ہے، مگر ان کے اعقاب اگر نادم ہوں اور سید صاحبؒ کی راہ پر ہوں تو ہم ان سے بھی وہی برتاؤ کریں گے جو سید صاحبؒ نے ان کے بزرگوں کے ساتھ کیا، شاید اللہ تعالیٰ انھیں یا ان کی اولاد کو دین کی کسی خدمت کی توفیق عطا فرمائے، صوبہ سرحد میں تمہارا سفر قریب ختم ہوگا، اللہ تعالیٰ اس سفر کو سید صاحب کے مشن کا جزو بنائے، اور اس مشن کی تکمیل میں اپنے ان ناچیز بندوں سے بھی کچھ خدمت لے، ہمارے قدیم دشمنوں کی اولاد اگر اللہ کا کام کرنے پر آمادہ ہوں تو ہمارے سر اور آنکھوں پر، اللہ تعالیٰ ہمیں "البغض فی اللّٰہ والحب فی اللّٰہ" کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا محمد الیاس صاحب کا حال آخر میں چودھری نعیم اللہ صاحب سے معلوم ہوا تھا وہ ہولی کی تعطیل میں گئے تھے، کہتے تھے کہ دست کے دورے ہوتے ہیں، کمزوری زیادہ ہے، غذا میں مٹھا ہوتا ہے۔

میری طبیعت تمہارے سامنے خراب تھی، مختلف شکایتیں بدل بدل کر ہوتی تھیں، تین مسہل لینے کے بعد بہت کمی ہے، اب برائے نام شکایت باقی ہے۔

عبدالغفار صاحب نگرامی (۳) علی گڑھ گئے تھے، مسلم یونیورسٹی کے دس

---

(۱) علاقہ سمہ کا رئیس جس کے مرکز پنجتار میں سید صاحب کا عرصہ تک قیام رہا۔ (ع)

(۲) ہنڈ کا رئیس جو سید صاحب کے مقابلہ میں مارا گیا۔ (ع)

(۳) مولانا عبدالغفار نگرامی ندوی۔ (ع) ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے، اور دارالعلوم میں استاد بھی رہے، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے رفقائے درس میں بھی تھے، اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے سلسلہ میں ان کے خلیفہ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ بھی تھے۔ (م)

پندرہ طلبہ میوات کے لیے اور کام کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں، پھر بلایا ہے، بارہ بنکی میں عمران خاں (۱) اور مطلوب صاحب (۲) بانسہ (۳) گئے تھے، اچھا کام ہوا، اور بنیاد پڑ گئی، ہردوئی، گونڈہ، اور دیوئی میں بھی کام درپیش ہے، یہاں بفضلہ تعالیٰ خیریت ہے۔

۲۳؍مارچ ۱۹۴۴ء　　　　　　　عبدالعلی

۷۔　برادر عزیز از جان سلمکم اللہ ووفقکم لما یحب ویرضیٰ (۴)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کراچی سے اور پھر کامران کے قریب سے تمہارے خطوط ملے، دوسرا خط تم نے ہوائی ڈاک سے بھیجا تھا، مگر تیرہ روز میں پہنچا، معلوم نہیں کیا سبب ہوا، بڑی فکر تھی کہ لاہور اور کراچی کے درمیان خالہ جان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے، گرمی کی تکلیف تو ہوئی مگر الحمدللہ کہ طبیعت اچھی رہی، پھر سمندر کا سفر اور برسات کا زمانہ اس کی فکر رہی، خط سے معلوم ہوا کہ سات روز طبیعت خراب رہی، اس کا اندیشہ ہی تھا، اللہ تعالیٰ

---

(۱) مولانا محمد عمران خاں ندوی امیر دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم اور مکتوب الیہ کے رفیق۔ (ع) مولانا محمد عمران خاں ندوی بھوپالی کی تبلیغی جدوجہد اور دینی و دعوتی سرگرمیاں ناقابل فراموش ہیں، بھوپال کا تبلیغی اجتماع آج بھی عالمی تبلیغی اجتماع کے طور پر ان کے حسن انتظام کا یادگار بنا ہوا ہے، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اس کا میزبان رہا کرتا تھا، مولانا عمران خاں صاحب کا مولانا محمد الیاس صاحب بڑا خیال فرماتے تھے، بیعت و اصلاح کا تعلق حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی سے رکھا، اور مجاز بھی ہوئے۔ (م)

(۲) مولانا مطلوب الرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم۔ (ع) مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کے بڑے بھائی۔ یہ بھی حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے رفقاء درس میں اور عزیز دوستوں میں تھے، نوعمری میں وفات پائی۔ (م)

(۳) حضرت سید عبدالرزاق شیخ ملا نظام الدین کا وطن ضلع بارہ بنکی میں ایک گاؤں۔ (ع)

(۴) یہ خط ۱۹۴۷ء میں پہلے حج کے موقع پر جب مکتوب الیہ والدہ ماجدہ اور اہل خانہ کے ساتھ عزیزی مولوی سید محمد ثانی سلمہ کی معیت میں حجاز اس نیت سے گیا تھا کہ وہاں کے تبلیغی کام میں حصہ لے اور خاص طور پر عربوں میں دینی دعوت کے لیے زمین تیار کرنے کی کوشش کی جائے، یہ خط مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد ہی ملا۔ (ع)

ان تکلیفوں کو کفارۂ سیئات اور رفع درجات کا ذریعہ بنائے، امید ہے کہ یہ تکلیفیں بیکار نہ جائیں گی اور وہاں کے کام کے لیے طبیعت کو زیادہ تیار کردیں گی، چکر اور متلی اور ضعف کی وجہ سے ان ایام میں کام کا موقع نہ ملا تو انشاء اللہ اجر میں کچھ کمی نہ ہوگی، جس کام کی نیت تھی اور ان عوارض سے وہ نہ ہوسکا، اس کا پورا اجر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ملنے کی پوری توقع ہے بلکہ نیة المرء خیر من عمله، اچھے رہتے اور کام کرتے تو جتنا اجر ملتا اس سے زیادہ کی توقع رکھنا چاہیے، جس سفر پر تم لوگ گئے ہو، اگر اتنا لمبا سفر کسی دوسرے مقصد سے ہوتا تو ہم لوگ ہر وقت پریشان رہتے، مگر اس مقصد کی برکت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بڑی خوشی رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب کو اپنے دربار میں حاضری کی عزت بخشی، ہم لوگ دعا کرتے ہیں رہتے کہ اللہ تعالیٰ پورے اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور قبول فرمائیں، اگر دل میں کھٹک رہتی ہے تو یہ کہ افسوس کہ میں تم لوگوں کے ساتھ نہ جاسکا، دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ یہ سعادت نصیب فرمائے اور میں بھی ہمراہ ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ اب تم لوگ مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی حاضری اور روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہوچکے ہوگے، یہ خیال کرکے پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور بے اختیار دل کھنچ رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے دلوں کو اپنی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور اتباع سے منور فرمائے۔

حج وزیارت کے سوا دوسرا کام جو اہمیت میں کم نہیں ہے شروع ہوچکا ہوگا، جہاں سے اس کام کی ابتدا ہوئی تھی اور پھر تمام عالم منور ہوا تھا، وہیں اللہ تعالیٰ نے اسی کام کے کرنے کا تمہیں موقع عنایت فرمایا ہے، اور جس نے ابتدا کی تھی اسی (۱) کے ظل عاطفت میں کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، اس کا شکر بندہ کے بس سے

---

(۱) أرواحنا ونفوسنا فداه صلى الله عليه وسلم.

باہر ہے، اَللّٰھُمَّ لكَ الحمدُ والشكرُ لا أحصى ثناءً عليكَ أنتَ كما أثنيتَ علىٰ نفسِكَ.

اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیم عاجز وناتواں ونا کارہ بندوں سے بڑے سے بڑا کام لے سکتی ہے، کیا تعجب کہ اللہ تعالیٰ اس بیج کو تناور درخت کردے جس کی جڑ اس ارض پاک میں ہو، اور شاخیں تمام عالم کو اپنے سایہ میں لے لیں، ممکن ہے کہ جو بیج تمہارے ہاتھوں لگ رہا ہے وہ ﴿كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ کا مصداق ثابت ہو، اپنے کام کو ہیچ اور نا کارہ سمجھتے ہوئے اس کے نتائج کو محض تائید الٰہی کی امید پر بڑے سے بڑا اور اہم سے اہم سمجھنا چاہئے اور اسی تخیل کے مطابق اجر کی امید رکھنا چاہئے، اور "أنا عند ظن عبدی بی" کا خیال کر کے اس کے ملنے کا یقین رکھنا چاہئے، کام کرتے وقت حوصلہ بلند رکھنا چاہئے اور تمام عالم کو نگاہ میں رکھنا چاہئے، ایک دفعہ تمام عالم یہاں کی شعاعوں سے منور ہو چکا ہے، دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ پھر یہیں سے امت کی نشاۃ ثانیہ کا سامان کردے، اور تمہیں بھی اس کا ذریعہ بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم دورافتادہ دعا گویوں کو محض اپنے لطف وکرم سے تم لوگوں کے ساتھ شامل فرمائے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توقع بیجا نہیں ہے، کسی عمل سے رضامندی بھی اجر کا سبب بنتی ہے، تمہیں اندازہ ہوگا کہ کتنا عظیم الشان کام ہے، گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہے، پھر اس کے لیے کتنی جدوجہد درکار ہوگی، یہی کام ایسا ہے جس کے لیے آدمی مرمٹے، اللہ تعالیٰ تمہیں اور سب کام کرنے والوں کو جدوجہد کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، حق تو یہ ہے کہ کون حق ادا کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ دل وجان سے اپنے کام میں لگنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور اسے قبول فرمائیں، اور اس کا اجر اپنے کرم کے اندازہ سے عطا فرمائیں۔

رابع (۱) کو جو تم نے میرے خط میں لکھا تھا وہ میں انشاء اللہ کل ان کو لکھ دوں گا، آج کے خط میں لکھنا بھول گیا، امید ہے کہ خالہ جان، ہمشیرہ، محمد ثانی اور سب خیریت (۲) سے ہوں گے، سب سے سلام اور دعا کہہ دینا، معین کی والدہ کا ہیضہ میں انتقال ہوگیا، (۳) دعائے مغفرت کرنا، اور خالہ جان سے بھی کہنا، خالہ جان اور ہمشیرہ (۴) سے کہنا کہ امید ہے کہ دعاؤں میں فراموش نہ کریں گی، تم سے تو اس کے کہنے کی ضرورت نہیں اور ان سے بھی بغیر کہے ہوئے اسی کی امید ہے، ساتویں یا دسویں دن خط لکھ دیا کرنا، امید ہے کہ مدینہ طیبہ سے ہوائی ڈاک پہنچ جایا کرے گی، سب تمہیں اور خالہ جان، ہمشیرہ وغیر کو سلام کہہ رہے ہیں فضل عظیم (۵) اور دوسرے

---

(۱) حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے بھانجے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد پھر مہتمم اور اب ناظم ندوۃ العلماء ہیں، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن تاسیسی بھی ہیں، اور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ بھی، اور اس طرح کی کتنی تنظیموں قومی وبین الاقوامی کے ذمہ دار اور ممبر ہیں، بارک اللہ فی حیاتہ ومتعنا اللہ والمسلمین بطول بقاءہ۔ (م)

(۲) افراد خاندان کے علاوہ وہ دیگر افراد ورفقائے سفر جو دعوت وتبلیغ کے کام سے جڑے ہوئے تھے، ساتھ گئے تھے، یا کچھ وہ جو وہاں ساتھ ہو لئے تھے۔ (م)

(۳) ڈاکٹر معین الدہر ہنسوی مرحوم نواسہ حضرت مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسوی، ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے ننیہالی اعزہ میں ہیں اور بھائی ہوتے ہیں، ۱۹۰۱ء میں جائس رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور ۲۳ جولائی ۱۹۸۳ء کو ہنسوہ فتح پور میں وفات پائی۔ (م)

(۴) خالہ جان یعنی والدہ ثانیہ مخدومہ سید خیر النساء بہتر صاحبہ مصنفہ، شاعرہ اور صاحب دل خاتون (م ۱۹۶۸ء) اور ہمشیرہ یعنی سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ صاحب قلم اور معلّمہ وداعیہ خاتون (م ۲۸ رجنوری ۱۹۷۶ء)۔ (م)

(۵) حاجی فضل عظیم مرادآبادی۔ (ع) تبلیغی جماعت کے سرگرم اور اولین داعیوں میں سے ایک بزرگانہ صفات وخصوصیات کے حامل اور شہر مرادآباد کے ممتاز لوگوں میں سے ایک تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بھائی حضرت ڈاکٹر عبدالعلی صاحب حسنی اور ندوۃ العلماء سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، بڑے دیندار اور مخیّر تھے، دین اور دعوت کے کاموں کو ان سے بڑی تقویت ملی، مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے تھے، درمیان میں ہندوستان آتے رہے، رائے بریلی کا آخری سفر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات پر تعزیت کے لیے کیا، اور مکہ مکرمہ میں ۲۴ رمارچ ۲۰۰۱ء میں انتقال فرماگئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، وہ مرادآباد (اتر پردیش) میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے، اس طرح انھوں نے ۷۶ رسال کی عمر پائی، ان کے داماد الحاج محمد انور صاحب مرادآبادی کہتے ہیں کہ ان سے ہمارا کاروباری تعلق بھی رہا، بڑا اصاف ستھرا تعلق، وہ ہمیں نصیحتیں فرماتے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

متعارف حضرات سلام قبول فرمائیں۔

۱۰؍رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ　　　　عبدالعلی

۸- برادر عزیز از جان سلمکم اللّٰہ تعالیٰ(۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسرت نامہ موصول ہوا، اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہاں کی آب وہوا تمہارے مزاج کے موافق ہے، طب کی کتابوں میں نیل کے پانی کی تعریف دیکھی تھی اور یقین نہ آیا تھا اب یقین آیا، اللہ تعالیٰ ہر جگہ کی آب وہوا کو تمہارے مزاج کے موافق بنادے، اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں تندرست اور قوی رکھے اور اپنے دین کی خدمت کی توفیق اور قوت عطا فرمائے، اور تمام مسلمانوں کو اس سے مستفید فرمائے جو حالات خط سے معلوم ہوئے اس سے بڑی خوشی ہوئی، ''اسمعی یامصر'' پڑھ کر خصوصاً بہت مسرت ہوئی، جو کچھ میرے دل میں تھا وہی تمہارے دل میں تھا، اس لیے زبان سے وہی نکلا، اثر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، وہی مقلب القلوب ہے، اللہ تعالیٰ تمام جدوجہد، ملاقاتوں، گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں کو قبول فرمائے، اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور دین وتقویٰ اور آخرت کی بھلائی کی ہی باتیں کرتے، مصنف ''سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ'' مولانا محمد ثانی حسنیؒ نے حجاز مقدس میں تبلیغی نقل وحرکت اور وہاں جدید اور ذی اثر طبقہ میں کام کا تعارف کراتے ہوئے حاجی فضل عظیم صاحب کی خدمات وقربانیوں کا بھی خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''حجاز تبلیغی کام کا ایک مرکز بن گیا، اور جدید طبقہ میں کام کا اچھا خاصہ تعارف ہوگیا، اس میں سب سے بڑا ہاتھ شروع میں کام کرنے والے باہمت لوگوں میں مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا سعید احمد خاں کھیڑوی، مفتی زین العابدین لائل پوری، حاجی فضل عظیم مرادآبادی، مولوی عبدالملک مرادآبادی نیز بعض دوسرے اور مہاجرین کا ہے، جنھوں نے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کیا مگر پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دی، ان لوگوں پر ایسے ایسے سخت دور آئے اور ان کو آزمائشوں سے گذرنا پڑا، جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ (م)

(۱) یہ خط اس وقت کا ہے جب مکتوب الیہ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں مقیم تھا۔

اوران مسلمانوں کو بھی یہی کرنے کی توفیق اور قوت عطا فرمائے، امیر عبدالکریم سے ملاقات کا حال معلوم ہونے سے خوشی ہوئی، اب وہ بھی بہت بوڑھے ہوں گے، امید ہے کہ شمالی افریقہ کے لیے ان کی جدوجہد جاری ہوگی، شمالی افریقہ اور فلسطین کے تمام دنیا کے عرب اپنے دلوں میں بے چینی پاتے ہوں گے، اور کچھ نہ کچھ کرتے ہوں گے، ضرورت اس کی ہے کہ نیت کی تصحیح کی جائے تاکہ اللہ عزوجل کی نصرت کے مستحق ہوسکیں اور اپنے جدوجہد میں ذکر اللہ کی کثرت کی جائے، امید ہے کہ مناسب موقعوں پر یہ یاد دلاتے رہو گے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان ممالک میں پہنچا کر بڑا فضل فرمایا ہے اور ایک پرانی تمنا پوری فرمائی ہے، اس کا شکر یہی ہے کہ کوئی موقعہ اور کوئی لمحہ اس کے دین کی خدمت سے خالی نہ رہے، الحمدللہ جہاں تک اندازہ ہوا ایسا ہی ہو رہا ہے مگر کارکن کو ہر موقع پر اپنی خدمت کو حقیر سمجھنا اور زیادہ سے زیادہ خدمت کا طالب رہنا چاہئے، الحمدللہ یہ بات بھی محسوس کررہا ہوں، مصر کا قیام بہت اہم معلوم ہو رہا ہے، جمال الدین افغانی نے عالم اسلام کا سفر سیاسی مقصد سے کیا تھا، اور وہ اتنا زمانہ گذرنے پر بھی بے نتیجہ نہیں رہا تھا، تمہارا سفر الحمدللہ دینی مقاصد سے ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ انقلاب انگیز ہوگا، گو اس وقت نتائج کا احساس نہ ہو، تم نے چسٹر بنوالیا، بہت ہی اچھا کیا، گو اب گرمی آرہی ہے مگر ترکی میں اس کی ضرورت ہوگی، اگر سوڈان جانے کا موقع مل گیا تو بہت اچھا ہوگا، اسمعی یا مصر میں جو تم نے افریقہ کے متعلق کہا ہے وہ بہت اہم ہے، وہی بات دوسرے اسلوب سے سوڈان میں بھی کہنے کی ہے، مصر میں جو رسائل چھپوائے ہیں ان کے لیے دوسو روپئے بھجوا رہا ہوں، دوسرے روز دو پونڈ کا منی آرڈر کیا جاتا ہے، اگر عبدالرشید صاحب (۱) یا معین اللہ

(۱) مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی ثم لکھنوی مراد ہیں، جو اس سفر میں ساتھ تھے، مکتوب الیہ کے شاگرد اور معاون تھے، اب وفات پاچکے ہیں، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (م)

صاحب(۱) کے نام مولوی عبدالغفور (۲) کے نام سے منی آڈر پہنچے تو وہ بھی اسی کے لیے سمجھا جائے، ان منی آڈروں کے بعد پچاس روپیہ اپنی طرف سے بھیجوں گا، وہ تمہارے ذاتی صرف کے لیے ہوں گے، اسی سلسلہ میں وہ بھی جائیں گے، کوپن تو ہوتا نہیں، اس لیے اسی خط میں اطلاع کردی۔

والد ماجد رحمہ اللہ کی کتابوں کی طباعت کی امید سے بڑی خوشی ہوئی، ''جنّــۃ المشرق'' (۳) کے آخری حصہ کا مقابلہ نہیں ہوا تھا، ذرا اس کو دیکھ کر دینا، امید ہے کہ بہت معمولی غلطیاں ہوں گی، میں نے بہت کوشش کی تھی کہ مقابلہ پورا ہوجائے مگر وقت کی تنگی سے نہ ہوسکا تھا، ''معارف العوارف'' (۴) کا تو بالکل مقابلہ نہیں ہوا، اندیشہ ہے کہ اس میں غلطیاں زیادہ نہ ہوں، اگر غلطیاں کم ہوں تو چچا(۵) کی کرامت سمجھوں گا، ''تلخیص الاخبار'' (۶) اور اس کی شرح ''منتہی الافکار'' (۷) کا بھی تذکرہ

---

(۱) نائب ناظم ندوۃ العلماء رہے، اور وفات سے چند ماہ قبل سرپرست ندوۃ العلماء کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی، ۲۳/اگست ۱۹۹۹ء کو اندور (مدھیہ پردیش) میں رحلت فرمائی، اور وہیں مدفون ہوئے، ندوۃ العلماء کے بڑے ہی بے لوث و مخلص کارکن رہے، اور مکتوب الیہ کے جاں نثار و وفا شعار رفیق و شاگرد، تبلیغی جدوجہد میں بھی ایک مقام پیدا کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (م)

(۲) ندوۃ العلماء کے دفتر نظامت میں بحیثیت مددگار ناظم رہے۔ (م)

(۳) ''الہند فی العہد الاسلامی'' کے نام سے یہ کتاب طبع ہوچکی ہے، سید احمد شہید اکیڈمی دارعرفات رائے بریلی سے بھی یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ (م)

(۴) ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' کے نام سے دمشق، شام سے اچھی طباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی، فی الحال یہ کتاب پھر ناپید ہوگئی ہے۔ (م)

(۵) مولوی سید عزیز الرحمٰن حسنی مرحوم جنھوں نے اس کتاب کی نقل کی تھی۔ (ع)

مکتوب نگار کے ہم زلف تھے، اور چچا بھی ہوتے تھے، اور مکتوب الیہ کے استاد بھی، رائے بریلی میں ۱۹۵۸ء میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ ان ہی کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر حسنی مرحوم ہیں جو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ہم عمر دوستوں میں تھے۔ (م)

(۶) ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے کئی ایڈیشن مختلف ممالک سے شائع ہوچکے ہیں۔ (م)

(۷) ''تنویر الآفاق'' کے نام سے زیر طبع ہے، مکتوب نگار کے پوتے مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کی تحقیق و مراجعت کے ساتھ منظر عام پر آنے کو ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ (م)

کر رکھنا، انشاء اللہ تعالیٰ اس کی طباعت کی بھی صورت پیدا ہونے کی آئندہ امید ہے، مولانا مناظر احسن صاحب دو تین روز کے لیے آگئے تھے، "ماذا خسر العالم" اور عربی رسائل ایک ایک انھیں دیدیا ہے، محمد (۱) نے عربی ترجمہ بحری ڈاک سے بھیج دیا ہے، مجھ سے پوچھتے تو میں ہوائی ڈاک سے بھجواتا، رابع سلمہ (۲) کے خط سے معلوم ہوا کہ "ماذا خسر العالم" کے جو نسخے تم نے بحری ڈاک سے بھیجے تھے وہ اب تک نہ پہنچے، اندیشہ ہے کہ ضائع ہوگئے ہوں، "نزهة الخواطر" جلد اول وجلد ثانی کی فروخت کا انتظام مصر میں ہوجاتا تو بہت اچھا ہوتا، اگر ضرورت ہو تو لکھو جلد اول بھیج دوں اور جلد ثانی حیدرآباد سے منگوانے کی فکر کروں، سیرت سید احمد شہیدؒ جو پاکستان گئی تھی، وہ سب پہنچ گئیں، محمد ثانی (۳) سے میں کہتا رہتا ہوں کہ مظفر شاہ صاحب (۴) کو قیمت کے لیے لکھیں، امید ہے کہ روپیہ آنے میں اب دقت نہ ہوگی، مصر سے آج کل پرچے شاذ و نادر آتے ہیں، بلکہ نہیں آتے، غالباً چندہ ختم ہوگیا ہوگا، اب تم وہاں موجود ہو تم نے اخبار ورسائل دیکھے ہوں گے، اخوان المسلمین نے بھی اخبارات جاری کیے ہوں گے، ندوہ کے لیے چند ہفتہ وار اخبار اور چند علمی رسائل منتخب کر کے اطلاع دو تو روپیہ بھیجوں، اگر اخباروں کے دفتر میں روپیہ بھیجنا مناسب ہو تو پتے لکھ دینا، اخبارات مواعظ کا مجموعہ نہ ہوں، جیسے النذیر اور منبر الشرق ہوتے ہیں، بلکہ اخبار

---

(۱) مولانا سید محمد الحسنی مرحوم بانی مدیر مجلّہ "البعث الاسلامی" ندوۃ العلماء لکھنؤ جو کہ مکتوب نگار کے فرزند ہیں۔ (م)

(۲) مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ حال ناظم ندوۃ العلماء و خواہر زادہ مکتوب نگار و مکتوب الیہ۔ (م)

(۳) مولانا سید محمد ثانی حسنی (ندوی ومظاہری) مکتوب نگار و مکتوب الیہ کے بھانجہ۔ (م)

(۴) مولانا سید مظفر حسین شاہ صاحب کشمیری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء میں ہیں، تبلیغی تحریک سے وابستہ تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ وقت استاد بھی رہے، اور ایک سرگرم داعی ومعلم کی حیثیت سے پاکستان میں دینی خدمات پیش کیں، "نور ایمان" کے نام سے اسلامیات کے مضمون کے لیے ایک سلسلۂ کتب تصنیف کیا جو کشمیر میں اور پاکستان کے تعلیمی اداروں میں رائج ہوا، ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے اور ۹ر نومبر ۲۰۰۱ء کو وفات پائی، رحمه الله تعالیٰ رحمة واسعة. (م)

ہوں، ہر ملک کی خصوصاً عالم اسلامی کی خبریں ہوں، سیاسی مقالات ہوں، مگر دین کے تحت میں ہوں، مصر کے مدارس کے لیے جغرافیہ کی جو کتابیں چھپی ہوں ان میں جو سب سے مفصل ہو اور اسلامی ملکوں کے حالات پر مشتمل ہو وہ بھی منگوانا ہے، اور جغرافی تاریخی اٹلس بھی منگوانا ہے (۱)، مولوی عبدالرشید صاحب سے کہنا کہ خود مختلف کتابیں دیکھ کر انتخاب کر کے تمہاری پسند کے بعد مجھے مطلع کریں۔

مصر کی فہرست کتب میں بعض سفر نامے بھی دیکھے ہیں، عبدالرشید صاحب ایسے سفر ناموں کو دیکھ لیں جو جدید ترین ہوں، اور اسلامی ملکوں کے حالات پر مشتمل ہوں، ان کے نام اور قیمت سے مطلع کریں، لغت کی کتاب "المعتمد" جو سرکاری مدارس میں رائج ہے، وہ دیکھ لینا، المنجد اور المعتمد کا موازنہ قیمت کا لحاظ رکھتے ہوئے کرنا، اگر المنجد سے المعتمد بہتر ہو تو وہ منگوائی جائے، دارالعلوم کے نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، حجاز و مصر میں رہنے سہنے کے بعد دارالعلوم میں جس تعلیم و تربیت کی ضرورت تمہیں محسوس ہوتی ہو، اس کے لحاظ سے رائے قائم کرو، اور مصر کی کتابوں پر بھی اس لحاظ سے نظر ڈالو کہ دارالعلوم کے لیے کونسی کتابیں موزوں ہوں گی، فقہ کے لیے اگر جدید اسلوب پر کتابیں تیار ہوئی ہوں تو ان کو نظر میں رکھنا تاکہ شرح وقایہ اور کنز و ہدایہ کے بجائے وہ داخل کی جائیں (۲)، غرض یہ کہ تحصیل علم کو

---

(۱) مکتوب نگار کے منصوبوں میں ایک منصوبہ ممالک اسلامیہ پر جغرافیائی کتاب کی تصنیف کا کام تھا، جسے انھوں نے اپنے بھانجے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے سپرد کیا، جس کا پہلا حصہ "جزیرۃ العرب" سے متعلق منظر عام پر آیا، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند اور دیگر بڑے چھوٹے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ (م)

(۲) حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کو اصلاح نصاب سے متعلق یہ جو فکر دامن گیر تھی وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب کو بھی رہی، بالآخر ان کے مشورہ و ایماء پر استاد گرامی مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جدید اسلوب فقہ کی کتاب "الفقہ المیسر" (قسم العبادات) تیار کی جو مقبول ہوئی، اور برصغیر میں متداول ہوئی، اب ان ہی کے شاگرد مولانا مفتی راشد حسین ندوی صاحب نے اس کا دوسرا حصہ (قسم المعاملات) بھی تیار کر دیا ہے، اور اسی فکر و توجہ کے نتیجہ میں ندوہ سے متعلق بعض اداروں میں تحفۃ الفقہاء (سمرقندی) کی تعلیم دی جارہی ہے، اصول فقہ میں مصر کے بڑے عالم شیخ عبدالوہاب خلاف کی کتاب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آسان کیا جائے اور معیار پست نہ ہونے پائے۔

مولوی معین اللہ صاحب اور مولوی عبدالرشید صاحب سلام مسنون قبول کریں۔

۱۷/مارچ ۱۹۵۱ء عبدالعلی

۹- برادر عزیز از جان سلمکم اللہ تعالیٰ(۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حجاز کے حالات سے بڑی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے آثار نظر آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، اور اس مرکز سے تمام عالم کو منور فرمائے، اس سے پہلے جو خطوط ارسال کئے ہیں وہ پہنچے ہوں گے، امید ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرمادے، اور تمہیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان وکرم کے مطابق اجر عطا فرمائے، بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے، مثلاً ہند، ایسے ملکوں کے غیر مسلموں میں استکبار قبول حق سے بڑا مانع ہے، افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہے ہیں، اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا متمدن مذہب سے ناآشنا ہے، گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے، قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی، اور تمہاری کوششوں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبول حق کے لیے کھول دیں، مصر افریقہ کا دروازہ ہے، اگر اہل مصر کو اس ذمہ داری کا احساس ہو جائے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) "علم اصول الفقہ" اور مولانا محمد اکرم ندوی (آکسفورڈ برطانیہ) کی "مبادی اصول الفقہ" ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کا جزو بن گئی ہیں، اس کے علاوہ مولانا ڈاکٹر علی احمد ندوی (جدہ) کی "القواعد الفقہیہ" بھی منظر عام پر آچکی ہے، مزید ان کا کام جاری ہے، ہدایہ پر بھی وہ کام کررہے ہیں، فقہ واصول فقہ پر ان کا کام اتنا وقیع ہے کہ وہ اپنی ان خدمات پر سعودی عرب کا بین الاقوامی فیصل ایوارڈ بھی حاصل کرچکے ہیں۔ (م)

(۱) یہ خط حجاز بھیجا گیا، جب مکتوب الیہ مصر کا ارادہ کررہا تھا۔

اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور مغرب صحراء اعظم اور صحراء کے جنوب کے اور مغرب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں مصر ہو کر گذریں تو ان کو دینی جدوجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ کریں، اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قرب کی غیر مسلم آبادیوں میں تبلیغ کے لیے نکلنے پر تیار کریں تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ نور اسلام سے منور ہو سکتا ہے، مصری سوڈان کا تعلق ایک طرف مصر ہے اور جنوب میں یوگنڈا، کینیا اور کانگو سے ہے، سوڈان کے لوگ بہ نسبت مصر کے تمدن جدید سے دور اور اسلام سے زیادہ قریب ہیں، مصر میں جو سوڈانی مقیم ہیں، ان میں بھی کام ہونا چاہیے، ازہر کے سوڈانی طلبہ کے ذریعہ سے تمام سوڈانیوں کو جمع کیا جا سکتا ہے، اور ان لوگوں کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے جو سوڈان کے رائے عامہ پر اثر رکھتے ہیں، اور قاہرہ میں مقیم ہیں۔

تمہارے آخر کے خطوں سے تمہاری صحت کا حال معلوم ہونے سے اطمینان ہوا، اللہ تعالیٰ صحت و قوت میں ترقی عطا فرمائے، اور تبلیغ میں پوری سعی اور جدوجہد کی توفیق اور قوت عطا فرمائے۔

مولانا حسین احمد صاحب (۱) کا والا نامہ موصول ہوا تھا، موصوف کو کچھ حال مکہ معظمہ کا معلوم ہوا، حضرت نے تمہارے لیے یہ کلمات لکھے ہیں:

"اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاق شر بنائے، اور حضرت سید صاحب (۲) شہید قدس اللہ سرہ

---

(۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نگار کے شیخ و مرشد اور مکتوب الیہ کے استاد اور وقت کے عظیم المرتبت مصلح، مجاہد، محدث اور قائد تھے، قدس سرہ العزیز۔ (م)

(۲) امیر المؤمنین سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ (شہید بالاکوٹ ۱۲۴۶ھ) مراد ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے تیرہویں صدی ہجری میں تجدید ملت اسلامیہ کا کار عظیم لیا، اور لاکھوں لوگوں کی اصلاح و ہدایت کا کام لیا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ (م ۱۹۴۴ء) فرماتے تھے کہ "ہم لوگ آج بھی حضرت سید صاحبؒ کی تجدید کے سایہ میں ہیں۔ (م)

کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت علیہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے، آمین۔"

۲۸/دسمبر ۱۹۵۰ء عبدالعلی

بہنوں کے نام خط (☆)

خواہران عزیزان سلمہما (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعائے فلاح دارین کے بعد معلوم ہو کہ تمہارا مسرت نامہ پہنچا، اس کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا، خوشی اس پر ہوئی کہ میرے خط نہ لکھنے سے تمہیں فکر اور شکایت ہوئی، اس سے تمہاری محبت کا اندازہ ہوا، ایک بھائی کو اپنی بہن سے اسی محبت کی توقع رہتی ہے، اس محبت کا اندازہ ہونے سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

افسوس اس لیے ہوا کہ محض میری کاہلی سے یا رمضان المبارک اور اس کے بعد گرمی کی شدت اور کچھ مصروفیتوں کی وجہ سے خط لکھنے میں کوتاہی ہوئی، اس سے میں نے تمہارے دل کو فکر میں مبتلاء رکھا، یہ فکر بھی محبت ہی کی وجہ سے تھی، محبت کی فکر و گداز بھی لطف سے خالی نہیں، خصوصاً جب غلط فہمی کی بناء پر ہو اور وہ غلط فہمی پھر رفع ہو جائے۔

(☆) یہ خط اب سے بیس سال پہلے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے اپنی بہنوں کو تحریر فرمایا تھا۔(م)

(۱) دونوں بہنوں سیدہ امۃ اللہ العزیز مرحومہ اور سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کے نام جو کہ عمر میں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سے چھوٹی تھیں اور دونوں ہی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بڑی تھیں، مقدم الذکر نے اپنے پیچھے ذی علم و باعمل اولاد چھوڑی اور مؤخر ہمشیرہ نے کتابوں کا ذخیرہ اور تصنیفات چھوڑیں، کچھ ایسا ہی معاملہ بھائیوں کے ساتھ پیش آیا، بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مکتوب نگار نے ذی علم اولاد چھوڑی اور چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تصنیفات کی ایک دنیا اور مسترشدین و مستفیدین (مع مریدین و تلامذہ) کا ایک عالم چھوڑا، رحمہم اللہ اجمعین۔

میں تمہارا بھائی ہوں، بھائی کو بہن سے جو محبت ہوتی ہے وہ بفضلہٖ تعالیٰ پوری مجھ میں موجود ہے، اور اس میں کبھی کمی نہیں آئی، بعض وقت دل میں شکایت آئی تو وہ بھی محبت ہی کا کمال تھا۔

اب تو شکایت بھی نہیں ہے، مگر محبت اپنے کمال پر ہے، اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھی ویسی ہی محبت ہے، امید ہے کہ تمہیں پورا اطمینان ہو گیا ہوگا۔

۱۷ر شوال المکرّم (۱) عبدالعلی

داماد کے نام خط (☆)

نور چشم عزیز از جان سلمکم

السلام علیکم

تمہارا خط پہنچا، بے حد خوشی ہوئی، باٹا (امین آباد میں جوتوں کی مشہور دوکان) کی جگہ مجھے بھی پسند نہ تھی، مجبوراً کوشش کی گئی، جب تمہارا پہلا خط آیا تھا تو دیکھتے ہی میرا جی چاہا کہ تمہیں تار دوں کہ چھوڑ کر چلے آو، جہاں آدمی نماز مشکل سے پڑھ سکے وہ جگہ ٹھہرنے کے قابل کہاں۔ مگر میں نے خیال کیا کہ بھائی جی کا مشورہ پہلے ضروری ہے، چند روز گذرے تو رائے میں وہ شدت نہ رہی، خیر جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا، باٹا کلکتہ جانے کا ایک بہانہ ہو گیا۔ مجھے تو یہ جگہ پسند ہے جہاں اب ہو، کام بھی جھگڑے کا نہیں ہے، حبیب (۲)

---

(۱) ملاحظہ ہو ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ (لمۃ اللہ تسنیم نمبر ص/۱۲۳) مئی-جون ۱۹۷۶ء

(☆) یہ مکتوب اس مجموعۂ مکاتیب میں تھا جسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مرتب فرما کر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ میں شائع کرایا تھا، اس رسالہ کی تحقیق وترتیب کے دوران راقم کو مکتوب الیہ جد مخدوم ومکرم جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب زید مجدہم (داماد حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ) کے کاغذات میں ملا، خط کی افادیت کے پیش نظر نذر قارئین ہے۔

(۲) جناب سید حبیب الرحمٰن صاحب حسنی (م ۱۹۷۴ء) مکتوب الیہ کے پھوپھی زاد بھائی اور مربی، اور عارف باللہ حضرت شاہ سید ضیاء النبی حسنیؒ (م ۱۹۰۶ء) کے پوتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے قرآن مجید کا بڑا حصہ ان کی ہی نگرانی میں حفظ کیا، حافظ صاحب ان کے ماموں زاد بھائی تھے اور مکتوب الیہ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ (م)

کی رفاقت ہے، جن سے بہتر آدمی تلاش کرو تو نہ ملے، اور محکمہ ایک عزیز کے ماتحت۔ یہ سب باتیں یکجا ملنی مشکل ہیں، اگر افسوس ہے تو اس کا کہ دور ہو اور بنگال میں ہو، معلوم نہیں آب وہوا کیسی ہے، بنگال کا شمالی حصہ ہے، اس لیے مشرقی بنگال کی سی رطوبت اور جنوبی بنگال کی سی گرمی نہ ہوگی، پھر بھی بنگال ہے۔

ہمارے یہاں ہر ایک تم کو یاد کرتا ہے، جب تک تم یہاں رہے خواہش رہی کہ تمھیں آرام ملتا، مگر ہماری خواہش کے مطابق تمھیں راحت نہ ملی۔

یہ تمھاری لیاقت ہے کہ تھوڑے کو بہت سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ تمھارے رزق میں وسعت عطا فرمائے، اور بعافیت رکھے، اس سے بڑھ کر خوشی ہوئی کہ پہلے ہی دن سے پوری تنخواہ نکالی گئی، اللہ تعالیٰ مزید ترقی عطا فرمائے۔

لکھنا کہ وہاں کی آب وہوا کیسی ہے، ملیریا تو نہیں ہے، پانی کہاں کا پیتے ہو، اب تم کاڈ لیور آئل پینا شروع کردو، جاڑے میں پی لیا کرو۔

حبیب سلمہ سے سلام کہہ دینا، تمھاری والدہ اچھی ہو رہی ہیں، لڑکیاں سلام کہتی ہیں، اور والدۂ محمد دعا کہتی ہیں۔(۱)

۸/نومبر ۱۹۴۱ء عبدالعلی

---

(۱) والدہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم یعنی اہلیہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی جو کہ مکتوب الیہ کی ساس تھیں، ہنسوہ فتح پور کے حسینی سادات سے تھیں، ایک صاحبزادہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے علاوہ پانچ صاحبزادیاں تھیں، سب سے بڑی صاحبزادی مکتوب الیہ کو منسوب ہوئیں، اب یہ سب اولاد اپنے رب کے حضور پہنچ چکی ہیں۔

خط اس وقت لکھا گیا جب سلسلۂ ملازمت دادا صاحب مخدومی جناب سید محمد مسلم حسنی بنگال (غیر منقسم) گئے تھے، دور جانے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو فکر وتشویش تھی، ڈاکٹر صاحب کی بڑی صاحبزادی ان ہی کو منسوب تھیں۔

پوسٹ کارڈ پر پتہ: ''محمد مسلم حسنی، آفس آف اسسٹنٹ کنٹرولر جوٹ ریگولیشن دیناج پور بنگال'' درج ہے۔ (م)

ایک یادگار اور تاریخی مکتوب (☆)

بنام ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ

ہندوستان کے پہلے وزیر قانون اور دستور ہند کے معمار آنجہانی ڈاکٹر امبیڈکر ملک کے پسماندہ ہریجن طبقہ کے مسلمہ لیڈر تھے، بیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی خدمات، اپنے علم ومطالعہ اور ممتاز منفرد وعبقری شخصیت کی وجہ سے اس ملک کے سیاسی اور سماجی میدان میں مخصوص مقام حاصل کرلیا تھا، صدیوں سے اعلیٰ ذات کے ہاتھوں پامال اچھوتوں میں ڈاکٹر امبیڈکر نے نئی روح پھونک دی تھی، غالباً ١٩٣٠ء میں انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ملک کے سات کروڑ اچھوت بحیثیت مجموعی اس مذہب کے حلقہ بگوش ہوجائیں گے، جو انصاف ومساوات پر مبنی ہو اور طبقاتی تفریق اور اونچ نیچ کا مخالف ہو، ڈاکٹر امبیڈکر کے اس اعلان نے امن وسلامتی انصاف ومساوات کے علم بردار مذہب ''اسلام'' کے ماننے والوں میں امید ومسرت کی ایک لہر دوڑادی، اور مسلمانوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ڈاکٹر امبیڈکر اپنے پیروؤں کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوجائیں، اس موقع پر ایک کوشش ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرف سے بھی ہوئی تھی، مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ایم. بی. بی. ایس (ناظم ندوۃ العلماء) اور مولانا خلیل محمد عرب صاحب انصاری رحمۃ اللہ علیہ (١)

(☆) یہ وہ یادگار اور تاریخی مکتوب ہے جسے مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم ایڈیٹر ''تعمیر حیات'' ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ١٠؍مئی ١٩٧٣ء کے شمارے میں اپنی تمہیدی سطروں اور توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ (م)

(١) شیخ خلیل بن محمد بن حسین انصاری یمانی ١٣٠٤ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے، عربی زبان وادب کا ذوق وذائقہ رکھتے تھے، اس کی تدریس میں بڑی مہارت اور اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی، قرآن مجید سے بڑا شغف تھا اور یمنی اخلاق وخصائل کے پیکر تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز فضلاء میں تھے، کراچی میں ٢٠؍جمادی الاول ١٣٨٦ھ کو وفات پائی۔ (م)

(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی صاحب ندویؒ کو ڈاکٹر امبیڈکر سے ملاقات و گفتگو کے لیے کچھ لٹریچر دے کر بمبئی روانہ کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس زمانہ میں تعلیم سے حال ہی میں فارغ ہو کر دارالعلوم میں استاد مقرر ہوئے تھے، اور موصوف کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ تھی، اپنی نوعمری کے باوجود مولانا علی میاںؒ نے جس دلسوزی اور حکمت سے ڈاکٹر امبیڈکر تک اسلام کی دعوت پہنچائی، اس کا اندازہ درج ذیل خط سے ہوتا ہے، جو مولانا موصوف نے اپنے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم (ناظم ندوۃ العلماء) کے نام لکھا ہے،

بدقسمتی سے ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش ناکام رہی مگر اس خط سے اس دور کے مسلمانوں کی دینی جدوجہد اور غیر اقوام تک دین کی دعوت پہنچا کر اتمام حجت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے جذبہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اور اس بات کی تحریک بھی پیدا ہوتی ہے کہ مسلمان زندگی کے ہر موڑ پر اور مساعد و نامساعد ہر قسم کے حالات میں تبلیغ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی سعی کرتا رہے۔ ؎

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لآ الٰہ الا اللہ

۲۲؍رجب، دوشنبہ ۱۳۵۰ھ

خلافت ہاؤس
بائی کلہ، لولین، بمبئی

برادر محترم مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں کل یکشنبہ کو گیارہ بجے کے قریب بمبئی پہنچا، خلافت ہاؤس میں قیام کیا، عبدالسلام صاحب (۱) نے مولانا عرفان (۲) کے نام خط دے دیا تھا، یوں بھی وہ آپ سے بخوبی واقف ہیں، عمادی صاحب (۳) دارالعلوم کے ایک ساتھی وہاں موجود ہیں، ان سے بہت سہولت ہوئی اور اب بالکل گھر کی طرح ہے، کھانے اور ناشتہ کا وہیں انتظام ہے، کل ہی شام کو شرف الدین صاحب کی دوکان پر آیا، عبدالصمد صاحب (۴) نے کہ ڈاکٹر گور (۵) گئے تھے، انھوں (۶) نے دوسرے روز ساڑھے آٹھ بجے بلایا،

(۱) مولانا عبدالسلام قدوائی۔ (ندوی رائے بریلوی بانی ادارۂ "تعلیمات اسلام" لکھنؤ سابق ناظم شعبۂ دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی وسابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ متوفی ۳۰؍رمضان المبارک ۱۳۹۹ء) (م)

(۲) تحریک خلافت کے ممتاز رہنما اور مولانا محمد علی جوہر کے خاص معتمد۔ (آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری اور خلافت ہاؤس کے ناظم اعلیٰ تھے۔) (م)

(۳) مولانا ابراہیم عمادی ندوی، استاد بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی۔ (حضرت مولانا علی میاں صاحب کے رفیق درس، کئی کتابوں کے مصنف اور ذی علم شخصیت تھے، کتابوں میں "خاتم النبیین، علم شہریت ونظام حکومت، اسلامی محمدی تقوی" یادگار ہیں، ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، ۸۲ سال کی عمر میں ۱۸؍جنوری ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔) (م)

(۴) مالک مطبع قیمہ وشرف الدین بکڈپو۔

(۵) ایک نومسلم ڈاکٹر۔ (ڈاکٹر مظہرالحق گور یوپی کے رہنے والے تھے اور ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، ممبئی میں ان کے مکان پر کثرت سے علماء قیام کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب موصوف دینی خدمت اور اشاعت اسلام میں مصروف رہتے تھے۔)

(۶) ڈاکٹر امبیڈکر۔

دوسرے روز گئے تو کہہ دیا کہ میں مصروف ہوں ملاقات نہیں ہوسکتی، عبدالصمد صاحب نے کہا کہ میں نے انگریزی میں ایک طویل خط لکھا ہے، خلاصہ سنایا تو معقول اور موثر معلوم ہوا، خلافت ہاؤس میں معلوم ہوا کہ مولانا عرفان بھی ملنے گئے تھے، اور زیادہ توقع لے کر نہیں آئے ہیں، ان باتوں سے دل شکستہ اور مایوس تو نہیں ہوا لیکن فکر پیدا ہوگئی، زیادہ فکر اس کی تھی کہ اگر ملنے سے انکار یا عذر کردیا تو پھر دروازہ ہی بند ہوجائے گا، اور یہاں آنا بالکل بیکار ہوگا، میری کوئی حیثیت نہیں اور نہ وسائل ہیں، اغلب یہی ہے کہ نہ ملیں، یوں بھی لوگ بہت پریشان ہوں گے، اور بیسیوں ملنے جاتے ہوں گے، تار ہی پڑھنے کی فرصت نہ ہوگی۔

آج صبح جانے کا قصد کیا، مولانا عرفان سے پتہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ملنا بیکار ہے، میں اللہ کا نام لے کر چلا، یہاں سے ایک اسٹیشن آگے (دادر) بمبئی کے مضافات میں ہے، وہیں ان کا مکان ہے، تلاش کے بعد ان کا مکان ملا، میں کوئی وزیٹنگ کارڈ نہیں لے گیا تھا اس لیے خیال ہوا کہ آج صرف مکان دیکھ کر اور ملنے کا مناسب وقت دریافت کرکے آجاؤں گا، مگر اندر گیا تو معلوم ہوا کہ آج ہی گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب(۱) احمد آباد جارہے ہیں، حسن اتفاق پر خدا کا شکر ہے ادا کیا اور انتظار میں بیٹھ گیا، میرے ساتھ آٹھ دس اچھوت اور منتظر تھے، میں نے پوچھا آپ لوگ ہریجن ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں، میں نے کہا کیا ڈاکٹر صاحب مہاتماجی (۲) سے ملنے جارہے ہیں، انھوں نے کہا نہیں، ہم لوگ اور ہیں مہاتماجی اور، کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب آگئے، مجھ سے پوچھا کیا کام ہے، پھر اوپر آنے کے لیے اشارہ کیا، کمرہ میں

---

(۱) ڈاکٹر امبیڈکر۔

(۲) مہاتما گاندھی۔

گیا تو دیکھا کہ میز پر کتابیں ڈھیر ہیں جیسے ابھی کوئی پڑھ کر گیا ہے، ان میں قرآن مجید کا ترجمہ علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب کا ''آئیڈیل پرافٹ'' اور کئی کتابیں تھیں، جیسے معلوم ہوتا کہ مطالعہ کرتے ہیں، میں نے کتابیں دیں اور کہا کہ میں لکھنؤ سے خاص آپ سے ملنے آیا ہوں، اور جو کچھ اس وقت سمجھ میں آیا کہا، میں نے کہا کہ تاریخ کا پہلا موقع ہے اور شاید آخری، اگر یہ موقع نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا، پوری قوم کو آپ نجات دے سکتے ہیں، صرف سیاسی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور نہ کیجیے، بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی، مسلمان اس گئی گذری حالت میں بھی بڑے سے بڑا امتحان دے سکتے ہیں، پھر عرب صاحب (۱) کا پیغام پہنچایا، آپ کا بھی ذکر کیا، ڈاکٹر صاحب نے گفتگو توجہ سے سنی اور کہا کہ یہ میرا اکیلے کا مسئلہ نہیں، پوری اچھوت قوم کا ہے، جلدی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، ان کی متحدہ رائے معلوم ہونی چاہیے، میں نے کہا کہ انھوں نے ہر جگہ ناسک کے فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، اور آپ پر اعتماد ظاہر کیا ہے، آپ کی رائے یقیناً مؤثر ہوگی، لکھنؤ کانفرنس کی رپورٹ آپ نے پڑھی ہوگی، کہا کہ ہاں آج ہی اخبارات میں پڑھی ہیں، اور جلسے طلب کروں گا، اور ان سے مشورہ کرلوں گا، اس کے بعد میں نے اسلام کی مساوات پر مختصر سی گفتگو کی اور انھوں نے توجہ سے سنی، میں نے کہا کہ میں آپ ہی کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں، جو خدمت میرے اور میرے خاندان کے لائق ہو فرمائیے، آپ کب تک واپس آئیں گے، کیا میں اس وقت تک

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ان کے استاد مولانا خلیل عرب صاحب نے ہدایت فرمائی تھی کہ اگر ڈاکٹر امبیڈکر اور ان کی قوم کو اسلام قبول کرنے میں اس وجہ سے تردد ہو کہ مسلمان ان سے مساوات کا معاملہ خاص طور پر ازدواجی مسائل میں نہیں کریں گے تو انھیں آپ یقین دلائیں کہ ایک انصاری عرب اپنی بیٹی کا بیاہ کسی بھی نومسلم اچھوت کے ساتھ کرنے پر تیار ہے۔

ٹھہروں؟ کہا کہ پہلی دوسری نومبر تک آپ کے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں جو فیصلہ ہوگا سب کو اطلاع ہو جائے گی۔

یہ خلاصہ ہے ہماری گفتگو کا، چند باتوں کا میں نے خاص طور سے لحاظ کیا، آدمی سنجیدہ اور معقول ہے، اسلام کا اچھا مطالعہ کر رہا ہے، قوم کو اس پر بہت اعتماد ہے، وہاں سے نکلا تو ہریجنوں میں سے دو چار آدمی میرے پاس آئے اور بڑے اشتیاق سے پوچھا کہ کیا گفتگو ہوئی، میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا کیا بچار ہے؟ کہا کہ جو ڈاکٹر صاحب فرمائیں، انھیں تو اچھوتوں کی خدمت کرنی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے فریضۂ تبلیغ ادا کر دیا اور اللہ کی حجت تمام ہو چکی (۱)، اب یہ اس کی اور قوم کی قسمت پر منحصر ہے، لیکن اس کے فیصلہ کا انتظار نہیں کرنا چاہیے اور اس سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے، مسلمانوں کو اپنا کام کرنا چاہیے، پہلا کام یہ ہے کہ دیہاتوں اور گاؤوں میں اور ہر جگہ سب سے پہلے ان کو اپنی حالت کا احساس دلانا چاہیے اور اچھی تدبیر یہ ہے کہ ڈاکٹر کی ناسک والی تقریر ان کی زبان میں شائع کر کے تقسیم کی جائے، اس کے بعد اسلام میں مساوات وغیرہ پر تبلیغی مضامین تقسیم کئے جائیں، اور اس سے بڑھ کر عملاً مل کر اور دورہ کر کے کام کیا جائے، یہ کام فوراً شروع ہو جانا چاہیے اگر ابھی رائے ہو تو ایک مضمون گجراتی میں ترجمہ کرا کے یہاں اور خصوصاً ناسک میں تقسیم کر دیا جائے، اس کے لیے واپسی میں خود ناسک چلا جاؤں گا، اگر اب آپ یہاں میرا ٹھہرنا مفید نہ سمجھیں تو کرایہ اور نیز کچھ تھوڑی سی رقم طباعت کے لیے بھیج دیجیے، عرب صاحب کو بھی خط دکھا دیجیے گا یا مضمون سنا دیجیے،

(۱) ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی اور اپنی قوم کے لیے بدھ مت کو انتخاب کیا اور ان کو اپنی زندگی ہی میں اس غلطی کا احساس بھی ہو گیا کہ اس انتخاب سے قوم کی حالت نہیں بدلی۔ (م)

مولوی محمد علی مدراس میں ہیں، اور محی الدین صاحب قصور میں۔(۱)

جواب جلد دیجئے۔

آپ کا

علی (۲)

●●●●●

(۱) مولوی محمد علی قصوری، مولوی محی الدین قصوری جو غیر مسلموں میں تبلیغ ودعوت کے کام سے بڑی دلچسپی لے رہے تھے، اور فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے۔ (م)

(۲) اس دلسوز مکتوب اور اس کے پس منظر کو کاروان زندگی حصہ اول ص/۱۵۶ تا ۱۶۴ میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جس میں مکتوب نگار نے واقعیت اور حقیقت حال کو بخوبی بیان فرمایا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ تقدیری بات ہے اور ''إنک لاتهدی من أحببت ولکن الله یهدی من یشاء'' کی تفسیر معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی اور اپنی کمیونٹی کے لیے بدھ مت کا انتخاب کیا، غالباً ان کو اپنی زندگی ہی میں اپنے اس انتخاب کی غلطی اور ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کے انجام کا احساس ہوگیا، اور اگر ان کو نہیں ہوا تو ان کی کمیونٹی (Community) اور پڑھے لکھے صاحب فکر اچھوتوں کو اب شدت سے یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ اس تبدیلی سے ان کی تقدیر نہیں بدلی، جیسا کہ مسٹر V.T.Rajshekar کی کتاب Ambedkar and his Conversion کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ (کاروان زندگی ۱/۱۶۰)